تحریر: علامہ ارشد القادری
ناشر: مکتبہ فریدیہ ہائی سٹریٹ ساہیوال
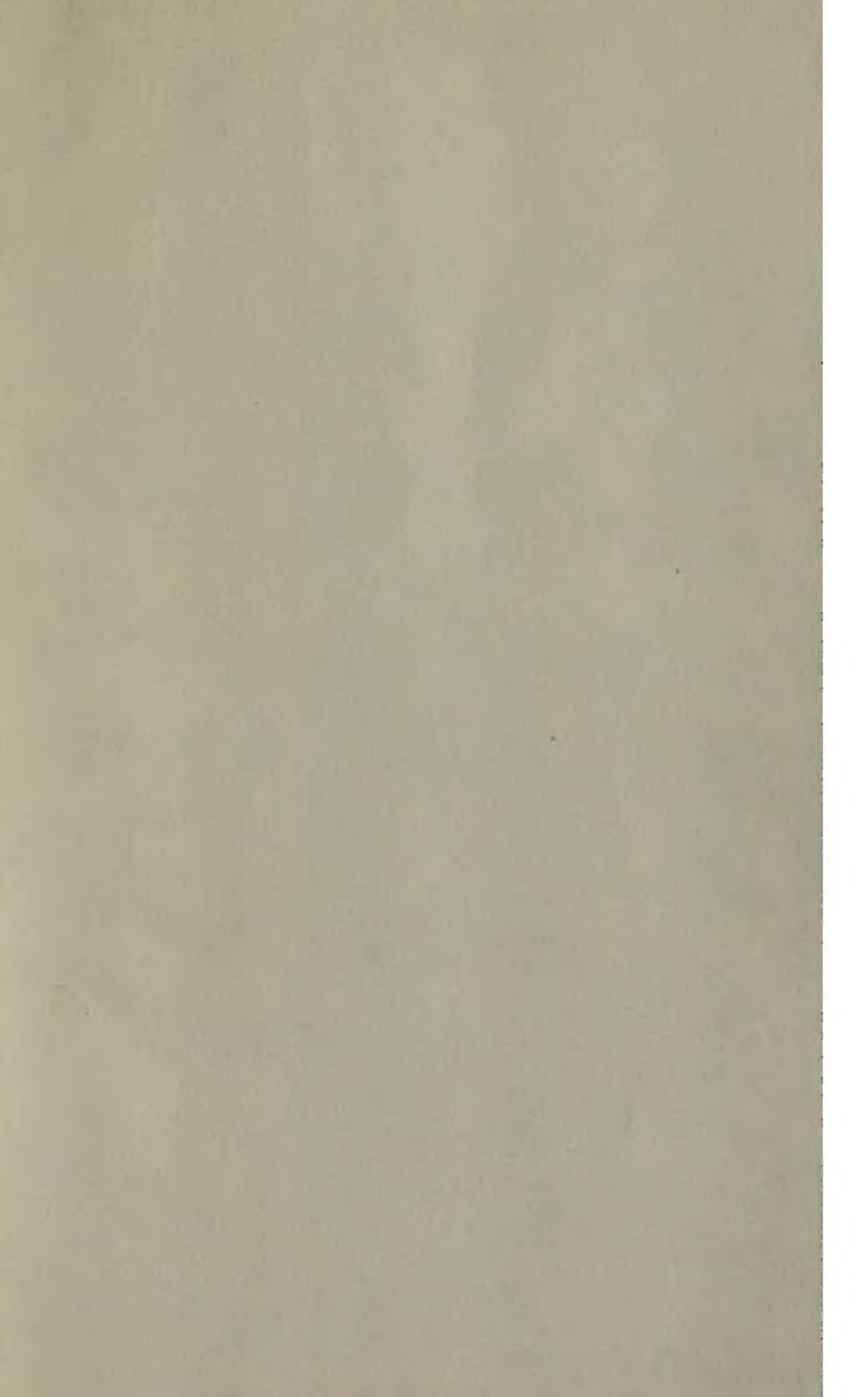
بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایمان افروز مضامین و دلچسپ حکایات کا حسین و جمیل

مجموعہ

سیر گلستان

رشحات قلم

ملک التحریر علامہ ارشد القادری بریڈ فورڈ لندن

ترتیب جدید

ابو العطا حافظ نعمت علی چشتی سیالوی

ناشر

مکتبہ فریدیہ
جناح روڈ۔ساہیوال

نام کتاب ـــــــــــ سیرِ گلستاں

سائز ـــــــــــ ۱۸ x ۲۳ / ۸

ضخامت ـــــــــــ ۱۷۶ صفحات

تعداد اشاعت ـــــــــــ ایک ہزار

رشحاتِ قلم ـــــــــــ ملک التحریر علامہ ارشد القادری

ترتیبِ جدید ـــــــــــ ابوالعطار حافظ نعمت علی چشتی سیالوی

ناشر ـــــــــــ مکتبہ فریدیہ جناح روڈ ساہیوال

کتابت ـــــــــــ جبار طارق خوشنویس ساہیوال

مطبوعہ ـــــــــــ تجارت پرنٹرز ۴۳ ریٹیگن روڈ لاہور

قیمت : مجلد ۵۰/۱۶ روپے

عنوانات کتاب

نوٹ!

مقالات و مضامین کا مجموعہ

"سیرِ گلستاں حصہ دوم"

عنقریب حاضر خدمت کیا جائے گا۔
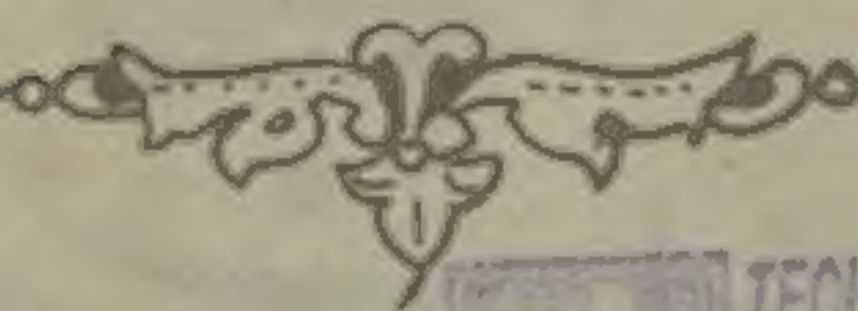
عرضِ ناشر
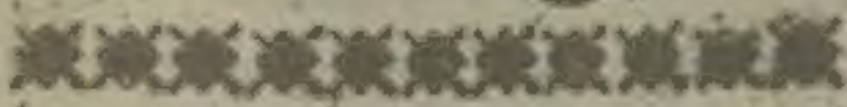
علامہ ارشدُ القادری کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں حضرتِ موصوف دنیاءِ اہلسنت کے وہ مایۂ ناز سپوت ہیں جن پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ آپ ایک عظیم فاضل بہترین مدرس اور کامیاب مناظر ہونے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور فنِ تحریر میں بھی اپنا جواب آپ ہیں۔ قدرت نے آپ کو تحریر کا ایسا ملکہ عطا فرمایا جو بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ کی تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا بلا تکان بیسیوں صفحات پڑھ جاتا ہے اور ذہن پر بوجھ محسوس کرنے کی بجائے فرحت و خوشی محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ آپ کا ہر مضمون آپ کی ذہانت اعلیٰ صلاحیت اور وسیع حلقۂ معلومات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصنیفات کو اپنے تو اپنے غیر بھی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ زلزلہ، تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی، زلف و زنجیر وغیرہ کتب ہند و پاک میں اپنی مقبولیت کی بنا پر زبان زد عام و خاص ہیں۔ اِس سے قبل مکتبہ فریدیہ نے آپ کی دو کتابیں "محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن میں" اور "منکرینِ رسالت کے مختلف گروہ" کئی مرتبہ شائع کیں اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیں ـــــ اب آپ کی خدمت میں حضرتِ موصوف کے مضامین کا حسین و جمیل مرقع پیش خدمت ہے۔ یہ وہ مضامین ہیں جن میں سے اکثر پاکستان میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوئے۔ علم دوست احباب کے پُر زور مطالبے پر فقیر نے یہ مضامین انتہائی محنت سے جمع کئے ہیں۔ ایک ایک مضمون کیلئے مجھے کئی مرتبہ دُور دراز کا سفر طے کرنا پڑا اور اس طرح یہ گوہر ہائے گرانمایہ سلک میں پرو کر حاضر خدمت کر رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ احباب میری اس حقیر کوشش کو قبول فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں گے اور عملی طور پر دستِ تعاون بڑھاتے ہوئے ادارہ کی سرپرستی فرمائیں گے۔

العارض: ابوالعطار حافظ نعمت علی چشتی سیالوی
مالک مکتبہ فریدیہ ساہیوال۔

آسمان کا ہیرا

قندیلِ عرش کا نُور وادیٔ ظلمات میں

"اُف یہ کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی رات — ہر طرف خوفناک سیاہی اور ہولناک سناٹا!!
مگر اس وحشت ناک ویرانے میں انسانوں کی یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں"
ایک مسافر نے آگے بڑھ کر پکارا۔
"اے آدم کے فرزندو! تم آبادیاں چھوڑ کر یہاں کہاں آ گئے!"
کسی نے جواب دیا "خود نہیں آئے، قسمت برگشتہ لے آئی!!"
"مگر اس گھنی تاریکی میں تمہیں ٹھوکر لگ جائے گی، تمہارے بچوں کو درندے اُٹھا لے جائیں گے۔ کیا تمہیں اپنی سلامتی کی بھی فکر نہیں؟" مسافر نے کہا۔
"ٹھوکر تو لگ ہی چکی ہے، کیا دوبارہ ٹھوکر لگے گی؟ ٹھوکر نہ لگی ہوتی تو ہمارا قافلہ یہاں کیوں ٹکراتا؟ سلامتی کی فکر، مت پوچھو! بڑی غمناک کہانی ہے یہ" سردار قافلہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا تم نے؟ ذرا کھل کر کہو۔ تمہاری باتوں سے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری گھائل زندگی کا کوئی بہت گہرا راز ہے، جسے تم چھپا رہے ہو" مسافر نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔
ہاں ایسا ہی کچھ سمجھ لو! لیکن تم ہماری نامرادیوں کی غمگین داستان سن کر کیا کرو گے؟ اس وادی میں سینکڑوں برس گذر گئے ہمیں ٹھوکریں کھاتے ہوئے۔ تم جیسے بہت سے دردمند مسافر ادھر سے گذرے اور کچھ دیر کے لئے ہمارے پاس ٹھہر گئے تمہاری ہی طرح انھوں نے بھی ہمیں اس زندان بلا سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب ہم نے اپنی مصیبتوں کا دردناک آزار ان سے بیان کیا تو وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ تمہارے زخم کا علاج انسانوں کے پاس نہیں ہے۔ انتظار کرو، شاید آسمان سے تمہارے لئے کوئی مرہم شفا اُترے۔

اس لیے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ضد نہ کرو۔ ہماری تھکا دینے والی حسرت انگیز کہانی سُن کر تم بھی وہی کروگے جو تمہارے پیشرو کر چکے ہیں۔ تم ایک مسافر ہو، جاؤ اپنا راستہ پکڑو — تمہاری ہمدردیوں کا بہت بہت شکریہ" سردار قافلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اب تو اور بھی تمہاری باتوں نے مجھے سراپا شوق بنا دیا — اب میں تمہاری داستان غم سنے بغیر یہاں سے ٹل نہیں سکتا۔ یقین کرو! میں ان راہگیروں میں نہیں ہوں جو تمہاری پُرنم آنکھوں پر صرف اپنی آستین رکھ کر چلے گئے۔ میں نے خود بھی درد والم کے گہوارے میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے تمہارے دل کی دھڑکنوں کا راز مجھ پر چھپ نہیں سکتا۔ اب تمہیں اپنا قصۂ غم سنانا ہی ہوگا" مسافر نے پیار بھرے انداز میں جواب دیا۔

"فطرت انسانی میں کتنی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی نقشہ تھا ان راہگیروں کا بھی جو تمہارے لفظوں میں ہماری پُرنم آنکھوں پر صرف اپنی آستین رکھ کر چلے گئے۔ وہ بھی ہمارا افسانۂ ابتلا سننے کے لئے اسی طرح بیتاب تھے جس طرح تم ہو۔ اظہار شوق کے مرحلے میں تم اور وہ بالکل یکساں نظر آتے ہو، اس کے بعد کی منزل میں تم ان سے مختلف ہو جاؤ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

بہر حال تم ہماری کہانی سننے پر بضد ہو تو سُنو! لیکن اس امید میں نہیں کہ ہماری مشکلات کی گرہ کھول دو گے بلکہ صرف اس لئے کہ ہمارے قافلہ سے تم دل شکستہ ہو کے نہ جاؤ" اتنی گفتگو کے بعد سردار قافلہ نے ایک لمبی سانس لی اور داستان سُنانا شروع کیا۔

"دیکھو! بہت دنوں کی بات ہے۔ نہیں میں نے غلط کہا، بلکہ اس وقت کی جب روئے زمین پر انسانوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی اس وقت کائنات کے خدا نے آسمان پر ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا۔

ایک عرصۂ ناپید اکنار تھا، جس میں ایک طرف بلند قامت پہاڑوں کے لنگر کھڑے تھے۔ دوسری طرف زمین کا گول کرہ رکھا ہوا تھا، اور ٹھیک پائے گاہِ شاہی کے سامنے انسانی روحوں کی بھیڑ جمع تھی۔ جب ساری خلقت آموجود ہوئی تو خدائے لاشریک نے اپنے سرا پردۂ جلال و جبروت سے ایک چمکتا ہوا ہیرا نکالا — اس کی تابش جمال کا کیا حال بیان کروں کہ کسی میں نظر ملانے کی تاب نہ تھی۔ بس نگاہوں پر ایک تیز تر شعاع کی چوٹ پڑی اور

آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

خدائے فلک نے تمام حاضرین دربار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "دیکھو! یہ میرے گنجینۂ قدرت کی ایک نہایت قیمتی امانت ہے جو اس کی حفاظت کا حق ادا کر سکتا ہو وہ آگے بڑھے۔ یہ ہیرا میں اس کے حوالہ کر دوں گا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ایک لمبی مدت کے بعد پھر ایک دربار عام منعقد کروں گا۔ اس دن یہ امانت بالکل اسی حالت میں واپس کرنا ہوگی۔ اور یہ بھی سن لو کہ ادائے حق میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو جہاں میری بارگاہ عدل میں محنت وفا کا شاندار صلہ ہے، وہاں سرکشی کی عبرت ناک سزا بھی ہے۔"

خدائے برتر کا یہ اعلان سن کر ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں عام طور پر خیال تھا کہ آسمان کا چوڑا چکلا سینہ یہ بار امانت ضرور قبول کرے گا۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب آسمان پر یہ امانت پیش کی گئی تو دہشت سے اسے زلزلہ آگیا۔ ہیرے کے لیے پتھر کا جگر مشہور ہے۔ آسمان کے انکار کے بعد اب خطاب شاہی پہاڑوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"کرۂ خاک کے پہرہ دارو! کہو تو تمہارا سینہ چاک کر کے یہ امانت رکھ دوں؟"

یہ سننا تھا کہ پہاڑوں کی مغرور پیشانی پر پسینے آگئے گھٹنے ٹیک کر عرض کیا "ہماری چوٹیوں کو رفعت کا تاج بخشنے والے مالک! تیری امانت کا جلال ہم سے نہیں اٹھ سکتا۔ ہمارا سینہ پھٹ جائے گا، ہماری کمر ٹوٹ جائے گی۔"

اب زمین کی باری تھی —— فرمان سلطانی اس سے یوں مخاطب ہوا:

"اے آغوشِ فطرت! تیرے دامن پر شاخ گل سے کوئی ننھا سا دانہ بھی گر جاتا ہے تو تو اسے ضائع نہیں ہونے دیتی۔ تیری ہی دیانت و وفا پر نباتات کی انجمن آباد ہے۔ میرے خزانۂ کرم کا یہ ہیرا تو ہی اپنے دل میں رکھ لے نا؟"

یہ سن کر زمین نے اپنا خاک آلود چہرہ ایوان شاہی کی دہلیز پر رکھ دیا اور لرزتے ہوئے کہا "اے جبروت والے بادشاہ! تو خوب جانتا ہے کہ تیری چھوٹی بڑی کائنات کے قدموں سے پامال ہونے والی میں ایک عاجز و کمترین مخلوق ہوں۔ بھلا میرے اندر کہاں اتنا حوصلہ کہ تیری پر جلال امانت کا بار اٹھا سکوں؟"

اس بھرے دربار میں سب کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ سب کی نظر اپنی ہی نجات و سلامتی پر تھی — لیکن انسان کھڑا سوچتا رہا کہ ایک بندۂ وفا شعار کو اس بحث سے کیا سروکار کہ حق امانت ادا کرنے کی اہلیت اس میں ہے یا نہیں؟ اسے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مالک کی رضا کیا ہے؟ مشیت یہ امانت کسی کے حوالہ کرنا ہی چاہتی ہے تو اسے قبول کرنے میں پس و پیش کیوں کیا جائے! جو امانت دے رہا ہے وہی اہلیت بھی بخش دے گا اور بالفرض اگر دوست کی خاطر ہم ہلاک بھی ہو گئے تو اس میں زیاں کیا ہے؟ یہ سوچ کر انسان آگے بڑھا اور اس نے انجام سے بے خبر ہو کر ہیرے کو اٹھا لیا۔ اس مجمع کائنات میں سب کے سب حیرت سے انسان کا منہ تکتے رہ گئے۔ اس کی بے محابا جرأت پر بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا۔ خود شاہ فلک نے انسان کی جسارت بے خطر دیکھ کر کہدیا۔ "غضب کا ظالم ہے انجام سے بے خبر انسان بھی"

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔

اس کے بعد دنیا میں انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی نسل ساری زمین پر پھیل گئی — ہر عہد میں کچھ خاص قسم کے انسان شہنشاہ کی طرف سے دنیا میں آتے رہے جنھوں نے ہاتھوں ہاتھ اس ہیرے کی حفاظت کی۔ وہ تمام نسل انسانی کو اپنی زندگی میں ہدایت کرتے رہے کہ خبردار وہ ہیرا ضائع نہ ہونے پائے ورنہ آئندہ جو دربار منعقد ہونے والا ہے اس میں انسانوں کی بڑی ہی رسوائی ہوگی۔

میرے مہربان مسافر! آج ہزاروں سال کا عرصہ گزرا کہ اس ریگستانی ملک میں شام کا ایک بوڑھا معمار اپنے شیر خوار بچے اور اپنی وفادار بیوی کو لے کر آیا اور ایک بے آب و گیاہ پہاڑی کے دامن میں چھوڑ کر چلا گیا — دم رخصت اس کی یہ مناجات بڑی ہی رقت انگیز تھی۔

"رَبَّنَا اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ"

(پروردگار! تیرے محترم گھر کے قریب، ایک بے آب و گیاہ ریگ زار میں میں نے اپنی نسل کو آباد کیا ہے اب تو ہی ان کا نگہبان ہے)

دنیا سے رحلت کرتے وقت مقدس باپ نے وہ آسمانی ہیرا اپنے اسی ارجمند بیٹے کے

حوالہ کر دیا — یہ ہمارا تحفہ جو تم دیکھ رہے ہو، آدمی کی نسل سے آ رہا ہے۔ جس وقت ہمارا مورثِ اعلیٰ دنیائے فانی سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس نے خاندان کے بڑے بوڑھوں کو اپنے قریب بلایا جب سب آکر اس کے گرد جمع ہو گئے، تو اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہ ہیرا نکالا اور ہچکیاں لیتے ہوئے قوم کے سرداروں سے کہا۔

"دیکھو، موت میرے سرہانے کھڑی ہے۔ اور عنقریب وہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی کی ایک دیوار حائل کر دے گی۔ اس حالت میں جبکہ میری آنکھیں پتھرا رہی ہیں اور ہمیشہ کے لئے میں تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ نسل انسانی کے آباؤ اجداد سے جو امانت یہ ہیرا ہاتھوں ہاتھ مجھ تک پہنچا ہے میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں — میری حیات کے یہ آخری جملے تم دل کی تختیوں پر لکھ لو۔ سب کچھ بھول کر بھی اسے نہ بھولنا۔

دیکھو! یہ دنیا اب اپنے آخری مرحلے سے گزر رہی ہے۔ عنقریب یہ اسی نقطہ پر پہنچنے والی ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ لیکن تم سے پہلے مجھ سے پہلے انسانوں کے لاکھوں کارواں وہاں پہنچ چکے ہیں۔

تم چھوٹے بڑے سب گواہ رہنا کہ تم تک یہ امانت پہنچا کر میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا — اب نسل انسانی کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے تمہیں گزرنا ہو گا۔ قدم قدم پر رہزنوں کی جیبیں تمہاری تاک میں ہوں گی۔ — خدائے قدیر تمہیں سفر کی خیریت اور راہ کی سلامتی نصیب کرے۔

اتنا کہہ کر ہمارے قبیلے کے بوڑھے باپ نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہمیں یتیم بنا گیا۔"

یہاں پہنچ کر سردار قافلہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس کی آواز رقت انگیز ہو گئی — تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کے پھر کہا۔

"میرے غمگسار مسافر! اس حادثے کے بعد کئی سو برس تک ہمارے قافلہ میں ہاتھوں ہاتھ وہ ہیرا منتقل ہوتا رہا اور ہم خوشی خوشی زندگی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ لیکن ایک دن ہم اسی وادی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر

وہ ہیرا گر پڑا — اندھیری رات تھی، ہر چند ہم نے تلاش کی، وہ نہ ملا۔

اس وقت سے لے کر آج تک ہم اسی ہیرے کی تلاش میں یہاں بھٹک رہے ہیں۔ اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے ہمارا سارا قافلہ نڈھال ہو چکا ہے۔ کتنی ہی بار ہم سو کر جاگے اور جاگ کر سوئے، لیکن نہ جانے کتنی لمبی رات ہے کہ اب تک سحر نہ ہوئی۔

آہ! اب کس منہ سے ہم آسمانی دربار کا رخ کریں گے۔ جو لوگ ہم سے پہلے جا چکے ہیں وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے مگر انہیں کیا خبر کہ درمیان راہ میں ہماری متاعِ حیات لٹ گئی؟

وائے حسرت و شکیب! کل کے منتظر جو منہ دیکھنے آسمانی دربار میں نسل انسانی کے تمام افراد ہمیں کیا کہیں گے؟ فرزندانِ آدم میں ہم لوگ کس قدر ننگ پیدا ہوئے تھے۔"

سردار قافلہ جب اپنی پوری کہانی سنا چکا تو مسافر نے سر اٹھایا اور دلنواز لہجہ میں کہا —

"سردار قافلہ! اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری سرگزشت زندگی رنج و محن کا ایک عبرتناک مجموعہ ہے — تمہارا قافلہ اس وقت جس وادی میں ٹھہرا ہوا ہے، اس کے متعلق ایک تاریخی راز میرے سینے میں محفوظ ہے، موقعہ سے بات نکل گئی ہے تو سن لو۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ ہمارے قبیلے کا ایک شیخ اس وادی سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک نکیلے پتھر سے اس کے عبا کا دامن الجھ گیا۔ وہ جھک کر اپنا دامن چھڑا رہا تھا اس کا ہاتھ ایک چکنے اور چوکور تراشے ہوئے پتھر پر پڑا۔ اس نے وہ پتھر اٹھا لیا۔ جب وادی سے نکل کر وہ اجالے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ یاقوت رمانی کی ایک تختی ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"یہ کفر و ضلالت کی وادی ظلمات ہے۔ یہاں تاریکیوں کی حکمرانی ہے۔ اس وادی میں سورج کی کرنوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ یہاں کسی نے آج تک صبح کا چہرہ نہیں دیکھا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے لئے کرب و الم کا یہ بڑا ہی دردناک حادثہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مطمئن ہوں کہ امید کا چراغ گل نہیں ہوا ہے۔ تم اپنے گوہر گمشدہ کی تلاش میں سرگرداں تو ہو، بس گھبراؤ نہیں۔ شہنشاہ فلک کی درگاہ بڑی ہی بندہ نواز بارگاہ ہے۔ اس ظلمت کدۂ بلا میں تمہارے لئے وہاں سے ضرور کوئی روشنی اترے گی اور تم اپنا گمشدہ ہیرا پا لوگے" مسافر نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔

لیکن ہم بدبختیوں کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے لئے کہیں سے غیب کے شہنشاہ کی
رحمت کنگرۂ فلک سے ہماری چارہ سازی کے لئے آئے، اگرچہ اس کے کرم کا سمندر ناپیدا کنار ہے،
مگر ہم تو ایک قطرۂ آب کے لئے ترس رہے ہیں کاش! اس کی محبت کا پسینہ ہی بن جاتا۔"
اتنا کہتے کہتے سردار قافلہ کی آواز گلوگیر ہو گئی اور بیساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی: ہائے
میرا ہیرا!" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مسافر سے یہ رقت انگیز حال دیکھا نہ جا سکا۔

"شہنشاہ فلک کی رحمت مجسم تمہارے سامنے کھڑی ہے اور تم اپنی بختیوں کا ماتم کر رہے ہو؟"
یہ کہتے ہوئے فوراً اس نے اپنے چہرے کا نقاب اُلٹ دیا۔

نقاب اٹھنا تھا کہ چاروں طرف روشنی سے بھر گئی اور دنیائے ظلمات کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔
اس کے بعد اس نے ریت کے ایک ڈھیر پر اپنی نگاہ برق کی ایک تیز شعاع ڈالی اور انگلی اٹھا
کر اشارہ کیا ـــ "وہ دیکھو تمہارا ہیرا چمک رہا ہے!"

سردار قافلہ نے دوڑ کر اسے اُٹھا لیا۔

اس حیرت انگیز واقعہ پر قافلہ والے دم بخود ہو کے رہ گئے جو جہاں تھا وہیں دیوارِ حیرت
بنا کھڑا کا کھڑا رہا، انہیں تو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ اپنے گمشدہ ہیرے کی بازیافت پر خوشی
کا مظاہرہ کریں۔

سردار قافلہ نے ادھر ہیرا اُٹھایا اور اُدھر مسافر نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی۔ اور یہ کہتا
ہوا رخصت ہونے لگا: ـــ "اچھا میں جا رہا ہوں، اب میری ملاقات وہیں ہو گی جہاں تمہیں یہ
امانت واپس کرنی ہے۔ میں خداوند فلک کی آخری روشنی ہوں، بالکل آخری!"

مسافر اتنا کہہ کر قدم اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ سردار قافلہ نے آگے بڑھ کر اس کی عبا کا
دامن تھام لیا۔

"میرے چارہ ساز! ابھی کہاں تم جا سکتے ہو! دیکھو ہماری پلکوں پر ستارے چمک
رہے ہیں۔ ابھی انہیں تمہارے قدموں پر نچھاور ہونا ہے۔ تم ہمارے قافلہ میں ایک اجنبی
مسافر کی طرح آئے مگر ہمارے دلوں کی سرزمین فتح کر لی ـــ پیارے! تم اپنی راجدھانی چھوڑ

کر کہاں جا رہے ہو؟ ابھی تو ہم یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو" سردار قافلہ نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔

" ویسے دامن جھٹکنے کی میری عادت نہیں، لیکن تم یہ جاننے کی کوشش نہ کرو کہ میں کون ہوں؟ تمہارا گوہر مقصود تمہیں مل گیا۔ تم خوشی خوشی اپنی راہ لو — جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے وہ میرا فریضۂ کرم تھا۔ میں تم سے جزا و شکر کا طلب گار نہیں،" (لا نطلب منکم جزاءً ولا شکوراً) بھرپور شان بے نیازی کے ساتھ مسافر نے جواب دیا۔

" لیکن کسی شخص کا تعارف تو انسان کا پیدائشی حق ہے اور پھر تم جیسا پیکر حیرت انسان، جسے دیکھ کر جاننے کی کوشش نہ کرنا ہی اپنی فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ تم دامن نہ جھٹکو میں دامن نہ چھوڑوں۔ اس سے بڑھ کر ارجمند گھڑی اور کیا ہو سکتی ہے؟ گذرے ہوئے عرصۂ عمر کی طرح تم اسے بھی دراز کر دو۔ کفارہ ہو جائے گا" سردار قافلہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

" دیکھو تم ایک مسافر ہو۔ غیر متعلق باتوں کو چھیڑنا مسافروں کا کام نہیں ہوتا۔ میں کون ہوں، یہ سوال تقاضۂ فطرت ضرور ہے، لیکن ہر سوال کا جواب دینا فطرت کے نزدیک ضروری کب ہے؟ دیکھو! میرے دامن سے شکستہ حال انسانوں کی لاکھوں امیدیں وابستہ ہیں، تم مجھے اجازت دے دو۔ کتنی پُرنم آنکھیں میری انتظار میں ہوں گی۔ تمہاری لایعنی باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے!" مسافر نے پُروقار لہجہ میں جواب دیا۔

" اچھا، تم نہ بتاؤ کہ تم کون ہو — لیکن ہمارے دل کی الجھن تو دور کر دو کہ تم زیر نقاب تھے تو ہر طرف تاریکیوں کا راج تھا اور تم بے نقاب ہو گئے تو تمہارے چہرے کی شعاعوں سے ہر طرف اجالا ہو گیا۔ آخر تم ہی بتاؤ کہ ہم تمہیں کیا سمجھیں؟ انسان یا فرشتہ؟ لیکن فرشتوں کا ایسا پیکر نہیں ہوتا اور انسان کا چہرہ سورج نہیں ہو سکتا۔ اب سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ تم حیرتوں کی ایک نئی مخلوق"

" میرے دلنواز! میں بڑی سماجت سے کہہ رہا ہوں کہ بید خاطر نہ ہونا۔" سردار قافلہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

" تم سے کئی بار کہہ چکا کہ میں کون ہوں؟ اس کے پیچھے نہ پڑو۔ لیکن تم اپنی ضد سے

باز نہیں آتے۔

"میں" کون "ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تمہاری عقل و فہم سے بالاتر ہے
(لم یعرفنی حقیقۃ غیر ربی (میرے رب کے سوا مجھے اور کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟)
اب بھی تمہاری تشفی نہ ہوئی ہو تو سنو کہ میرے جمال حقیقت پر بے شمار نقاب پڑے ہوئے
ہیں تاکہ تمہارے اندر تاب نظر باقی رہے اور تم میرے چہرے کی برکتیں لوٹ سکو ـــ وہ
بشریت کا نقاب تھا جسے ابھی تمہارے سامنے الٹا تھا اور وہ میرے چہرۂ حقیقت کا سب
سے پہلا نقاب ہے، جسے ڈال کر میں نے تمہاری انجمن میں قدم رکھا ہے تاکہ تم مجھ سے مانوس
ہوکر میرے دامن کے قریب آسکو، اور میں تمہیں خدائے قدوس کی بارگاہ اقدس تک پہونچا دوں۔
دیدۂ انسانی میرے چہرۂ حقیقت کا جمال دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی۔ اس کی رسائی صرف
میرے پیکر ظاہر تک ہے اور اسی سرمایۂ نظر پر قناعت کرنی ہے ـــ سمجھ گئے نا!"
پس تم اپنی نظر بھر دیکھ لو۔ پھر پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں! میرے کشور حسن میں آنکھوں
کے لئے اجازت نظارہ ضرور ہے، پر زبان کے لئے اذن سوال نہیں ـــ تم اپنی مقدور سے
آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔" مسافر نے تنبیہ کے انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

لیکن تم تو اس عنصری قالب میں بھی بشریت سے ماورا نظر آتے ہو۔ اور یہ کچھ ہماری
نگاہ کا اعجاز نہیں، تمہارے ہی جلوۂ آشکارا کا کرشمہ ہے۔ یہی تمہارا پیکر ظاہر جسے تم نے
ہمارا سرمایۂ نظر ٹھہرایا ہے، تمہارے جمال حقیقت کی غمازی کرتا ہے ـــ اب ہم نہیں
کہہ سکتے یہ ہمارا فریب نظر ہے یا فی الحقیقت تم ہی ایسے ہو؟" سردار قافلہ نے سہمے ہوئے
لہجہ میں کہا۔

"فریب نظر نہیں، ایک موجود حقیقت! لیکن بہت مبہم!! جیسے بادل کے سیاہ پردوں
میں چاندنی رات!!! پھر تم ہی سوچو اگر یہ اندیشہ محض بے بنیاد ہوتا تو خداوند قدوس کی بارگاہ
جلال سے اس اعلان کی ضرورت کیوں پیش آتی قل انما انا بشر مثلکم" نظر اپنے
زندان میں آزاد رہ کر بھی مجھے بشر ہی سمجھو۔ تو بتاؤ یہ کس خطرے کا دروازہ بند کیا جا رہا ہے!
میں امید کرتا ہوں کہ میری گفتگو کا اصل مدعا تم سمجھ گئے ہوگے، اور اب یہ سلسلہ ختم کروگے،

اچھا اب مجھے اجازت دو۔" مسافر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"فرطِ شوق کی یہ ایک بے ارادہ لغزش تھی جو خود رفتگی میں مجھ سے سرزد ہو گئی معاف کرنا میں نے بے محل سوال کر کے تمہیں زحمت دی۔ لیکن اتنا اور گوارا کر سکو تو وقتِ رخصت ذرا اپنا نام بتا دو۔ کم از کم تمہارے نام کی یادداشت ہی سے اپنے خاطر کو تسکین دیتا رہوں گا۔" سردارِ قافلہ نے نہایت مودبانہ انداز میں کہا۔

"تعجب ہے! زمین و آسمان کے زیر و زبر سے لے کر جنت و عرش کے بام و در تک دفترِ وجود کے ہر ورق پر میرے نام کی مہر ثبت ہے اور تمہیں نام بتانے کی احتیاج باقی رہ گئی ہے! کاش تم پوچھنے کی بجائے پڑھنے کی کوشش کرتے۔

اچھا فرض کرو ایک ایسی ہستی جو اپنی سرشت میں ہر طرح کی آلودگی سے بالکل منزہ پیدا ہوئی ہو، جس کا مزاجِ فطرت اتنا نفیس ہو اور اتنا برتر و عالی ہو کہ مکارم و فضائل اس کے دامن میں جگہ پا کر عزت و شرف حاصل کرتے ہوں اور پھر جو اپنے محاسن و کمالات میں زمین سے لیکر کنگرۂ عرش تک ساری کائنات کا مرجعِ حمد و ستائش ہو تو تم ہی بتاؤ، ایسی ہستی کو تم کس نام سے پکارو گے؟" ــــ مسافر نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

سردارِ قافلہ نے کہا "اس کا نام تو سوائے محمد کے اور کیا ہو سکتا ہے" (چونک کر) "تو کیا تم ہی ہو؟ تم ہی نبی آخر الزماں ہو؟ اے خوش نصیب! تم ہی تو ریگستانوں کے جھرمٹ میں چمکنے والی وہ تجلی فاران ہو جس کی خبر حضرت مسیح نے دی تھی؟"

عالمِ کیف میں ڈوب کر سردارِ قافلہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ یکبارگی گردنیں جھک گئیں اور دشت و کہسار کے گوشہ گوشہ سے آوازیں آنے لگیں۔

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا نبی اللہ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ

تب قافلے والے بھی دست بستہ کھڑے ہو کر عشق و عقیدت کی اس انجمن میں شریک ہو گئے۔

جل گیا۔ جنتوں کی سرزمین پر بہاروں نے پھول برسائے۔ نغمہ زاروں نے منہ چوما۔ گل ریز تبسم نے موتی لٹائے، حسن بے نقاب نے چراغاں کیا۔ روش روش نکھر گئی۔ چمن چمن سنور گیا۔ درشب نور کے نئے پیکر میں جگمگاتی ہوئی حوریں قطار باندھ کر ہر طرف کھڑی ہو گئیں۔ حرم کے در میں قدس کا عالم لطیف بن سنور کر آراستہ ہو گیا۔ اتنے میں آسمانی دنیا کا دروازہ کھلا۔ تجلیات کے جلو میں حضرت جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام آگے بڑھے۔ فضائے نور میں تیرنے والا برق رفتار ایک نورانی سواری آج ان کے ہمراہ تھی۔ آسمان کی بلندیوں سے اُتر کر سیدھے وہ گئے جہاں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لائے۔ آج ان کے آنے کا انداز ہمیشہ سے نرالا تھا۔ دروازے کے بجائے مکان کی چھت توڑ کر اندر داخل ہوئے۔

حبیب کبریا محو خواب تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ دل جاگ رہا تھا۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد حضرت جبریل آگے بڑھے۔ اور اپنے کافوری لب محبوب کے پائے ناز سے مس کر دیئے۔ ٹھنڈک محسوس ہوتے ہی نشان قدرت کی نرگسی آنکھیں کھل گئیں۔ دریافت فرمایا۔ جبریل کیسے آنا ہوا؟"

سفیر غیب نے جواب دیا: ــــــ "خدائے برتر کی طرف سے حریم عظمت میں تشریف ارزانی کا پروانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ سارا عالم قدس اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کے لئے چشم براہ ہے۔ وہ سرحد تجلیات جہاں وہم و خیال کے پر جلتے ہیں۔ جہاں ملکوت اعلیٰ تک کی رسائی ناممکن ہے۔ آج وہاں آپ کو اسی لباس بشری میں خرام ناز فرمانے کی دعوت دی گئی ہے۔ حضور تشریف لے چلیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک ساری گزرگاہوں پر امیدوں کا ہجوم بڑھ باندھے کھڑا ہے"

چند ہی لمحے کے بعد خاکدان گیتی کا ایک بشر براق پر سوار ہو کر مسجد حرام سے عالم قدس کی طرف روانہ ہوا کہ ملکوت اعلیٰ کے مرسلین نیاز مند غلاموں کی طرح رکاب تھامے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

مسجد اقصیٰ میں انبیائے سابقین کی ساری جماعتیں عقیدتوں کا خراج لئے حاضر تھیں۔ سرکار کی اقتدا میں نماز ادا کر کے سب نے امامت کبریٰ کے منصب کے ساتھ اپنی نیازمندی کا کھلا ہوا اعلان کیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر حضور آسمانوں کی طرف چلے۔ گزرگاہوں پر خیرمقدم

کے نئے پیغمبران اولوالعزم کھڑے تھے ہر جگہ قدسیوں کے پرے سلامی کے لئے جھکے ہوئے تھے
— عرشِ الٰہی کی مانوس فضا میں داخل ہوتے ہی بیتے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی، قدم پڑتے
ہی عرش کا دل خوشی سے جھوم اٹھا، پھر وہاں سے آگے بڑھے، بڑھتے رہے عالمِ بشر ہی
نہیں عالمِ ملکوت بھی پیچھے رہ گیا، پھر بڑھے، بڑھتے بڑھتے اب وہاں تک جہاں کی خبر کسی
کو نہیں معلوم — ایک محبوب اپنے محب سے، ایک بندہ اپنے معبود سے کس طرح ملا؟
ملتے کی آنکھ سے ان دیکھی ہستی کا نظارہ کیوں کر ہوا؟ کیا کیا باتیں ہوئیں؟ بارگاہِ شہنشاہی
سے محبوب کو کیا کیا نعمتیں عطا ہوئیں۔ یہ ساری تفصیلات صیغۂ راز میں ہیں — صبح ہوئی
تو سارے مکے میں ایک شور برپا تھا — اہلِ یقین و خرد خدا کی دیکھنے والی آنکھوں پر
نثار ہوگئے — لیکن نادانوں نے کہا: —

ایک بشر کے لئے عالمِ بالا کا سفر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ساری کہانی
بالکل من گھڑت ہے حیرت ہے کہ ایک پیغمبر کی زبان سے اس طرح کی
انہونی بات سننے میں آرہی ہے:

خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے چند فرشتے یہ باتیں سن رہے تھے انھوں نے
آپس میں کہا —

تمہیں وہ رات یاد ہوگی جس کی صبح کو عبداللہ کے آنگن میں نور کی
بارش ہو رہی تھی، زمین سے آسمان تک ہر عالم میں رحمت و مسرت کا
جشن منایا گیا تھا اور مکے کی ساری فضا فرشتوں کے پروں سے چھپ گئی
تھی — اس موقع پر جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سارا اہتمام محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کی تشریف آوری پر ہو رہا ہے، تو کچھ فرشتوں کو کتنی حیرت ہوئی تھی کہ وہ
قدس کا پروردۂ ناز اس ظلمت کدۂ خراب میں کیونکر تشریف لا سکتا ہے
اور آج جب وہ اپنی مانوس دنیا کی طرف چند لمحے کے لئے واپس تشریف
لے گئے تو بنی نوعِ انسان کے یہ نادان افرادِ حیرت سے واقعہ کا ہی انکار
کر رہے ہیں۔ حالانکہ دونوں جہان اس واقعہ پر گواہ ہیں محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کی یہ شان بھی عجیب ہے — وہ یہاں آئیں تو فرشتوں کو
حیرت — اور یہاں سے جائیں تو انسانوں کو حیرت — ان کی ذات
حیرتوں کا مجموعہ ہے —!"

دوسرے فرشتے نے جواب میں کہا: —

"دراصل حیرت تو ان انسانوں کی عقل پر ہے جو ان کے یہاں آنے پر
حیرت نہیں کرتے، جانے پر حیرت زدہ ہیں۔ حالانکہ کسی کا اپنے وطن میں
ہونا، باعث حیرت نہیں ہے۔ باعث حیرت غیر جگہ نظر آنا ہے۔"

جمال یار کی زیبائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا میں نے خوش بیانی سے

علامہ ارشد القادری

چہرے کی ہیئت بگاڑ دی گئی ہو پھر سر سے پا تک خون میں نہائے ہوئے اپنے ایک مسکین بندے کو اس حال میں دیکھ کر تو دریافت کرے،

یہ تُو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ میری دی ہوئی آنکھیں کیا ہوئیں، کان اور ناک کہاں پھینک آئے، تیرا خوبصورت چہرہ کیسے بگڑ گیا۔

پھر میں جواب عرض کروں۔

"ربِ عزت! تیرے اور تیرے محبوب کی خوشنودی کے لئے یہ سب کچھ میرے ساتھ پیش آیا۔ صرف اس تمنا میں میرا یہ حال ہوا کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیرے حبیب کو میں راضی کر لوں۔"

واقعات کے راوی بیان کرتے ہیں کہ دونوں وارفتگان کی پُرسوز دعائیں بارگاہ رب العزت میں قبول ہو گئیں، دوسرے دن میدان جنگ میں دونوں کے ساتھ وہی واقعات پیش آئے جو [illegible] رب کے حضور میں انہوں نے بطور دعا مانگی تھی۔

کہنے کی بات یہ ہے کہ دشمن پر فتح پانے کی دعا تو سبھی مانگتے ہیں لیکن اپنی ہستی کو دشمن کے حوالے کر دینے کی دعا ایک دم نرالی ہے — ایسی آرزو اسی کے سینے میں مچل سکتی ہے جس نے شہیدوں کی زندگی کا عروج ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ اور جس کی نگاہ میں مدنی محبوب کا ایک جلوۂ تبسم ساری متاعِ زندگی پر حاوی ہو گیا ہو۔

جلووں کی وادی

مکّہ سے چند میل کے فاصلے پر حُدیبیہ نام کی وادی تاریخی عظمتوں کی ایک بہت بڑی جلوہ گاہ ہے۔ عشق و ایمان کی بہت سی جاں فروز کہانیاں اس کے دامن سے وابستہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۶ ہجری میں اپنے پندرہ سو جاں نثاروں کے ساتھ طوافِ کعبہ کی نیت سے مکّہ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب مکّہ چند میل رہ گیا تو حدیبیہ

نام کی ایک وادی میں قافلے کے ٹھہرنے کا حکم صادر فرمایا۔ وہیں پر یہ خبر موصول ہوئی کہ کفار مکہ نے طے کر لیا ہے کہ وہ شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

یہ اطلاع پانے کے بعد سرکار نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ مکہ والوں سے جا کر کہیں کہ ہم لوگ جنگ کی نیت سے نہیں آئے صرف عمرہ کرکے صفا مروہ کی سعی اور خانۂ کعبہ کا طواف کرکے لوٹ جائیں گے۔ بے خطر وہ ہمیں حرم میں آنے کی اجازت دیں

سرکار کا یہ پیغام لیکر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکے کے لئے روانہ ہوگئے۔ شہر پہونچ کر انھوں نے سرداران مکہ سے ملاقات کی اور انھیں ساری تفصیل بتائی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔

ابھی حضرت عثمان مکے ہی میں تھے کہ کسی قافلہ میں یہ خبر اڑ دی کہ حضرت عثمان کو کفار مکہ نے شہید کر دیا۔ اس خبر کے مشتہر ہوتے ہی صحابۂ کرام میں سخت اضطراب و ہیجان برپا ہوگیا۔ صحابۂ کرام کی بیتابی دیکھ کر سرکار نے ایک درخت کے نیچے سب کو جمع کیا۔ اور اس بات پر ایک ایک شخص سے عہد لیا کہ اگر یہ خبر صحیح ہوئی تو خون عثمان کا انتقام لینے کے لئے جان تک کی بازی لگا دی جائے گی۔

ویسے سرکار سے یہ حقیقت مخفی نہیں تھی کہ یہ خبر غلط ہے اور حضرت عثمان زندہ و سلامت ہیں جیسا کہ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ سرکار کے ہاتھ پر جب سب لوگ بیعت کر چکے تو آخر میں حضور نے اپنے ایک دست کریم کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دیا اور اپنے دوسرے ہاتھ پر اُن کا ہاتھ رکھ کر ان کی طرف سے بھی بیعت لی —— اگر حضور کے علم میں وہ زندہ نہ ہوتے تو ہرگز انھیں بیعت میں شریک نہ فرمایا جاتا کیونکہ وفات یافتہ آدمی سے کسی معاہدہ پر قرار لینا قطعاً بے معنی ہے۔

اسی موقعہ پر بعض صحابۂ کرام نے نہایت حسرت کے ساتھ یہ کہا کہ حضرت عثمان ہم سے پہلے مکہ پہونچ گئے یقیناً انھوں نے خانۂ کعبہ کا طواف کر لیا ہوگا۔ حضور انور کو جب یہ بات

معلوم ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، عثمان بغیر ہمارے خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کریں گے۔

صحابہ نے پھر دریافت کیا کہ آخر کون سی چیز انھیں طواف سے مانع ہوگی جبکہ وہ حرم میں داخل ہو گئے ہیں۔ حضور نے جواب دیا۔ ان کا جذبۂ اخلاص کبھی انھیں اجازت نہیں دے گا کہ وہ بغیر ہمارے طواف کریں۔ چنانچہ جب حضرت عثمان واپس لوٹے تو صحابہ نے ان سے کہا کہ آپ نے تو خدا کے گھر کا طواف کر لیا ہوگا۔ یہ سن کر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ عشق و ایمان کا جذبہ ان میں انگڑائی لے کر آنکھوں سے پھوٹ پڑا۔ بھرے ہوئے جذبات میں یہ جواب دیا:—

میرے ساتھ اس سے زیادہ سخت بدگمانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں بغیر رسول اللہ کے خدا کے گھر کا طواف کر لیتا۔ خدا کا گھر تو پہلے سے موجود تھا لیکن گھر کی پہچاننے سے پہلے تو ہمیں گھر والے سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ غرض خداوندی کا یہ سارا تقرب تو رسول ہی کا عطا کیا ہوا ہے۔ انہی کے دم قدم سے خدا کے ساتھ ہماری روحوں کا یہ رشتہ وجود میں آیا ہے۔ بھلا میں اُنھیں چھوڑ کر کس منہ سے دربار خداوندی کا رُخ کرتا۔

قسم خدا کی ایک سال بھی اگر مجھے انتظار کرنا پڑتا تو میں اپنے رسول کے انتظار میں ایک سال تک خانۂ کعبہ کا طواف ملتوی رکھتا۔ قریش کے سرداروں نے بار بار مجھ پر اصرار کیا کہ میں خانۂ کعبہ تک آ گیا ہوں تو طواف کر لوں۔ لیکن میں نے ہر بار انکار کیا۔ کہ اپنے رسول کے بغیر ہرگز طواف نہیں کروں گا۔ چاہے خانۂ کعبہ میرے پیش نظر ہمیشہ کیوں نہ ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جواب نے خانۂ خدا اور حبیب خدا کا فرق اتنا واضح کر دیا ہے۔ کہ مذہب خداوندی میں رسول کی حیثیت سمجھنے کے لئے اب فکر و نظر کا کوئی حجاب باقی نہیں رہا۔ اب یہ راز پوری طرح واشگاف ہو گیا۔ کہ خداشناسی کی منزل میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام عرفان کیا ہے؟ پھر حضرت عثمان کا یہ مشرب بھی ان کی ذات کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ سرکار نے یہ وجہ بتا کر کہ ان کا جذبۂ اخلاص کبھی

اجازت نہیں دے گا کہ وہ میرے بغیر طواف کرلیں —— واضح کردیا کہ عشق و ایمان کا مزاج بھی یہی ہے۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمْ

اسی وادی میں عقیدت و عشق کا ایک اور نہایت رقت انگیز واقعہ پیش آیا۔ سہیل بن عمرو قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔ جب باتیں طے پاگئیں تو اب انہیں قیدِ تحریر میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

سرکار نے حضرت مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صلح نامہ کی عبارت لکھنے کے لئے بلایا۔ وہ کاغذ اور قلم لیکر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ کے بعد حضور نے صلح نامہ کی عبارت کا یوں افتتاح کیا ——

هٰذا ما صالح علیہ محمد رسول اللہ —— یہ وہ نکات ہیں جن پر محمد رسول اللہ نے مصالحت فرمائی۔

اتنا ہی فقرہ حضرت علی لکھنے پائے تھے کہ سہیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

" یہ کاغذ ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے۔ اس پر کوئی ایسی عبارت نہیں لکھی جاسکتی جس سے فریقین میں سے کسی کو اختلاف ہو۔ ہم آپ کو اگر رسول اللہ ہی تسلیم کرلیتے تو اس مصالحت کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی اس لئے آپ معاہدے کی عبارت سے رسول اللہ کا لفظ کٹوا دیجئے اور اس کی جگہ ابن عبداللہ لکھوایئے۔"

حضور نے یہ سوچ کر کہ مصالحت میں کوئی رخنہ نہ واقع ہو حضرت علی کو حکم دیا کہ ——

" رسول اللہ کا لفظ مٹا دو اور اس کے بجائے ابن عبداللہ لکھ دو۔"

بارگاہِ رسالت میں حضرت علی کا جذبۂ اطاعت شعاری محتاجِ بیان نہیں ہے۔ مقامِ صہبا میں آپ کا یہ ایثار ساری زندگی یاد رہے گا کہ آپ نے سرکار کے خوابِ ناز پر اپنی نماز جیسی متاعِ عزیز کو نثار کردیا تھا کہ حضور آپ کے زانوئے اطہر پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے۔ جس کے احساس وفا کی نگاہوں کا یہ عالم ہو کہ یعنی نیند محبوب کا ٹوٹ جانا بھی اسے گوارا نہ ہو اس کے دل نیاز مند کی فداکاریوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے —— لیکن

حدیبیہ کے چشم دید گواہوں کی زبانی یہ معلوم کر کے سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے کہ انہی حضرت علی کو جب حضور نے یہ حکم صادر فرمایا کہ "رَسُوْلُ اللّٰہ" کا لفظ مٹا دو تو اُن کا جذبۂ عقیدت اس حکم کی تاب نہ لا سکا۔ فرطِ الم سے دل کو ایسی ٹھیس لگی کہ جذبات قابو سے باہر ہو گئے۔

ایک ٹوٹ جانے والے گھائل کی طرح مچلتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔ ——

واللہ لَا اَمْحُوْکَ اَبَدًا —— قسم خدا کی میں ہرگز آپ کو نہیں مٹاؤں گا۔

مقامِ عجز و انکسار میں حضور اسے گوارا کر لیں تو کر لیں لیکن گدایانِ عشق اسے اپنے جذبۂ ایمان کی توہین سمجھتے ہیں۔ نقشِ قدم پر مٹنے والے یہ سننے کی بھی تاب نہیں رکھتے کہ محبوب کے اسمِ اعظم کا نقش مٹا دیا جائے۔

سہیل بن عمرو کے اصرار پر جب حضور نے دوبارہ کہا تو غیرتِ جلال سے حضرت علی کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور حالتِ اضطراب میں وہ اپنی تیغ ذوالفقار کے قبضے پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتے تھے کہ حضور نے اُن کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا اور خود ہی اپنے ہاتھ سے "رسول اللّٰہ" کا لفظ مٹا کر اس کی جگہ "ابن عبداللہ" لکھ دیا۔

عقلِ انسانی اس مقام پر حیران و ششدر رہ گئی کہ وہ نبی امّی جسے کبھی نوشت و خواند کا سابقہ نہ پڑا، ہو اس نے کیونکر ایک لفظ کو پڑھ کر مٹایا اور اس کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا۔

حضرت امام قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توجیہہ یوں فرمائی ہے۔ کہ یہ سب کچھ معجزہ کے طور پر حضور سے صادر ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ انداز جواب منزلِ عشق و عرفان کے مسافروں کے لئے ایک بہترین مشعل ہے اس کی روشنی میں ہمیں اس حقیقت کا سراغ آسانی سے مل جاتا ہے کہ مدنی سرکار مقامِ انکسار میں اپنے لئے جو بات پسند فرمائیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی اپنے سرکار کے لئے اسی رُخ پر سوچیں۔ یہ ان کا مقامِ تواضع ہے کہ اپنے خاک نشینوں سے ملنے کے لئے وہ فرازِ عرش سے نیچے اُتر آتے ہیں۔ لیکن ہمارا منصبِ غلامی ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ تو سر تا سر ہمارے ہی محسوس کرنے کی چیز ہے۔

پس سرکار کے تواضع پسند ارشادات کو بنیاد بنا کر جو لوگ حضور کی حقیقی عظمتوں کا

ارشاد فرمایا: —

"دوسرے کی چیز ہمارے لئے حلال نہیں ہے۔ انہیں قلعہ کی طرف لے جاؤ اور کنکر مار کر ہنکا دو یہ سب اپنے اپنے مالک کے پاس چلی جائیں گی۔"

چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا لیکن وہ شہادت کے ہیجان سے اسے ایک لمحہ قرار نہیں تھا وہ الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا اور مجاہدین اسلام کی صفوں میں شامل ہو گیا۔

واقعات کے راوی بیان کرتے ہیں کہ دوسرے دن جب میدان جنگ میں سپاہیوں کی قطار کھڑی ہوئی تو جذبۂ شوق کا اضطراب اس کے سیاہ چہرے سے شبنم کے سفید قطروں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ طبل جنگ بجتے ہی اس کے ضبط و شکیب کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ایک بیتاب دیوانے کی طرح دشمنوں کی یلغار میں کود پڑا۔

اس کے سیاہ ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلوار کا منظر ایسا دلکش معلوم ہوتا تھا جیسے کالی گھٹاؤں میں بجلی تڑپ رہی ہو۔

کہتے ہیں کہ نہایت بے جگری کے ساتھ اس نے دشمن کا مقابلہ کیا۔ زخموں سے سارا جسم لہولہان ہوگیا تھا۔ لیکن شوق شہادت کے نشے میں وہ دشمن کی طرف بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ چاروں طرف سے اس پر تلواریں ٹوٹ پڑیں۔ اب وہ نیم جان ہو کر زمین پر تڑپ رہا تھا۔ گھائل جسم میں اس کی روح مچل رہی تھی کہ اب جنت کا فاصلہ بہت قریب رہ گیا تھا۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد جب اس کی نعش حضور کے سامنے لائی گئی تو اس کے غم زدہ انجام پر سرکار کی پلکیں بھیگ گئیں۔

فرمایا — اسے جنت کی نہر حیات میں غوطہ دیا گیا۔ [illegible] چہرے کی پیشانی سے فردوس کے جلوے جگمگا رہے ہیں۔ اس کے پسینے کی خوشبو [illegible] آنچل پسار رہی ہیں۔ جنت کی دو حسین حوریں اسے اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے باغ خلد کی سیر کرا رہی ہیں — سبحان اللہ!

سرکار نے اس بات پر [illegible]

پھر زندگی پر سب متحیر تھے کہ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد سوائے جہاد فی سبیل اللہ کے اور کوئی عمل خیر نہیں کیا تھا۔ اس کے نامۂ عمل میں نہ ایک وقت کی نماز تھی۔ نہ ایک سجدہ تھا۔ سفید و شفاف کفن کی طرح زندگی کا سادہ ورق لئے ہوئے گیا اور بڑے بڑے زاہدان شب زندہ دار کو اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

سچ کہا ہے عارفان طریقت نے کہ عشق و اخلاص کی ایک جنون انگیز ادا ہزار برس کی بے ریا عبادتوں اور حسنات کے بے شمار ذخیروں پر بھاری ہے یہی وہ سکۂ رائج الوقت ہے جس میں آج تک کہیں بھی کھوٹ نہیں نکلی، اور کسی خانہ میں بھی اس کے نرخ کی سطح نیچے نہیں اتری جذبِ عشق کی ایک ہی جست نے عالمِ اسفل کے خاک زادوں کو بام عرش تک پہنچا دیا اور محبت ہی کا کرشمہ تھا جس نے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر اپنی شوکتوں کے پرچم اڑوائے اور روئے زمین کی بڑی سے بڑی حکومت کو اپنے قدموں کے نیچے روندوا ڈالا۔

بیوہ عورت

عشق و اخلاص کا ایک دردانگیز واقعہ

چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا۔ مدینے کی گلیوں میں ہر طرف نور برس رہا تھا پوری آبادی رحمتوں کی گود میں محو خواب تھی۔ آسمانوں کے دریچے کھل گئے تھے۔ فضائے بسیط میں فرشتوں کے پروں کی آواز دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ عالم بالا کا یہ کاروان شاید مدینے کی زمین کا تقدس چومنے آ رہا تھا۔

اچانک اسی خاموش سناٹے میں بہت دور ایک آواز گونجی۔ فضاؤں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ شبستان وجود کے سارے تار بکھر گئے۔ اور ایمان کی تپش چنگاریوں کی طرح بال بال سے پھوٹنے لگی۔

میخانۂ عشق کا دروازہ کھلا۔ کوثر کی شراب چھلکی، اور جذبۂ اخلاص کی والہانہ سرمستیوں میں سارا ماحول ڈوب گیا۔

یہ غلام اسلام کے آقا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز تھی۔ جس نے ہر گھر میں ایک ہنگامۂ شوق برپا کر دیا تھا۔

اب مدینے کی ساری آبادی جاگ اٹھی تھی۔

سرور کونین کا منادی ایک شکستہ گھر کے سامنے آواز دے رہا تھا۔

گلشن اسلام کی شادابی کے لئے خون کی ضرورت ہے۔ آج نماز فجر کے بعد مدینے کا لشکر ایک عظیم مہم پر روانہ ہو رہا ہے۔ مدینے کی رہنے والی اپنے نوجوان شہزادوں کا نذرانہ لے کر فوراً درگاہ رسالت میں حاضر ہو جائیں۔

کی آنکھ کا اُمنڈتا ہوا چشمہ سوکھ گیا۔

ماں نے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے کہا: —— "بیٹا! ابھی ابھی حضرت بلال، وہی بلال جنہیں ہم دہکتی ہوئی آگ کا نکھرا ہوا سونا کہتے ہیں، یہ اعلان کرتے ہوئے گذرے ہیں کہ اسلام کا پرچم دشمنوں کی زد پر ہے۔ آج نمازِ فجر کے بعد مجاہدین کا ایک لشکر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ آقا نے مومنین سے اپنے جاں نثاروں کی آرزو کی ہے۔ آج غیرتِ حق کا سمندر ہلکورے لے رہا ہے۔

رحمتوں کے تاجدار آج ایک ایک قطرۂ خون پر جنتوں کی بہار لٹا دیں گے۔ [illegible] آج قسمتوں کی ساری شکن مٹ جائے گی۔

کتنی خوش نصیب ہوں گی وہ دامن والیاں جو سپیدۂ سحر کی روشنی میں اپنے نورِ نظر کا نذرانہ لئے ہوئے سرکارِ رسالت میں حاضر ہوں گی!

آہ! کتنی قابلِ رشک ہوں گی ان کی یہ التجا یا رسول اللہ! ہم اپنے جگر کے ٹکڑے آپ کے قدموں پہ نثار کرنے لائی ہیں۔ اسی آرزو میں ان کو دودھ پلا پلا کر جوان کیا تھا کہ ایک دن ان کے لہو سے دین کا چمن سیراب ہوگا۔

یا رسول اللہ! ہمارے ارمانوں کی یہ حقیر قربانی قبول فرمائیں۔ سرکار! عمر بھر کی محنت وصول ہو جائے گی۔"

یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آواز بھرا گئی۔ بچہ ماں کو روتا دیکھ کر مچل گیا تو ماں نے کہا: —— "بیٹا فکر نہ کرو۔ دل کی چوٹ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں اپنا نصیب کو رو رہی ہوں۔ کاش! آج میری گود میں بھی کوئی جوان بیٹا ہوتا تو میں بھی اپنا نذرانۂ شوق لئے رحمتِ عالم کی بارگاہ میں حاضر ہوتی۔

افسوس کہ آج آخرت کے سب سے بڑے اعزاز سے میں محروم ہو گئی۔"

یہ کہتے کہتے پھر دل کا درد جاگ اٹھا۔ پھر غم کی تپش بڑھ گئی اور پھر آنکھوں کے چشمے سے آنسو اُبلنے لگے۔

بچے نے ماں کو چُپ کراتے ہوئے کہا —— "اس میں رونے کی کیا بات ہے ماں!

تمہاری گود تو خالی نہیں ہے۔ رحمتِ عالم کے حضور میں سب اپنے جوان بیٹوں کو لے کر جائیں گے۔ تم مجھی کو لے کر چلو!"

ماں نے پچکارتے ہوئے جواب دیا ——"بیٹا! میدانِ کارزار میں بچوں کو نہیں لے جاتے وہاں تو شمشیر کی نوک سے دشمن کی صفیں الٹنے کے لئے جوانوں کے کس بل کی ضرورت پڑتی ہے وہاں سروں پر چمکتی ہوئی تلواروں کی بجلیاں گرتی ہیں —— وہاں نیزوں کی انی سے کفر کے جگر میں شگاف ڈالا جاتا ہے —— میرے لال! وہ قتل و خون کی سرزمین ہے، تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟"

بچے نے ضد کرتے ہوئے کہا —— "یہ ٹھیک ہے کہ اپنی کمسنی کے باعث ہم میدانِ کارزار میں جانے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن بارگاہِ رسالت میں حاضری کے لئے تو عمر کی کوئی قید نہیں ہے —— ہماری قربانی سرکار نے قبول فرمائی تو زہے نصیب! اور اگر بچہ سمجھ کر واپس کر دیا تو کم از کم اس کا تو غم نہیں رہے گا کہ آقا کے لئے جان کی نذر پیش کرنے سے ہم محروم رہ گئے۔ جان چھوٹی ہو یا بڑی، بہرحال جان ہے اور جان ہونے کی حیثیت سے دونوں کی قیمت میں کوئی فرق نہیں ماں!

ماں نے فرطِ محبت میں بچے کا منہ چوم لیا۔ اور حیرت سے منہ تکنے لگی کہ اس کمسنی میں داناؤں جیسا شعور صرف اس رحمتِ خاص کا صدقہ ہے جو یتیموں کی نگراں ہے۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ جلوۂ زیبا کے پروانے آنکھوں میں خمارِ شوق لئے مسجدِ نبوی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ درد آشناؤں کے لئے ایک رات کا لمحۂ فراق بھی طویل مدت کی طرح بوجھل ہو گیا تھا۔ حجرۂ عائشہ کے خورشید کی پہلی کرن کے نظارہ کے لئے ہر نگاہ اشتیاقِ آرزو کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

نمازِ فجر کے بعد مسجدِ نبوی کے میدان میں مجاہدین کی قطاریں کھڑی ہو گئیں۔ جو نوجوان محاذِ جنگ پر جانے کے قابل تھے، انہیں لے لیا گیا، باقی واپس کر دیئے گئے۔ انتخاب کے کام سے فارغ ہو کر سرکار دولت کدہ تشریف لا ہی رہے تھے کہ ایک پردہ نشین خاتون پر نظر پڑی جو چھ سال کا ایک بچہ لئے کنارے کھڑی تھی۔

سرکار نے حضرت بلال سے ارشاد فرمایا: ———

"اس خاتون سے جاکر دریافت کرو، وہ بارگاہِ رحمت میں کیا نذر دینے آئی ہے؟"

حضرت بلال نے قریب جاکر نہایت ادب سے پوچھا: ———

"دربارِ رسالت میں آپ کیا فریاد لیکر حاضر ہوئی ہیں؟"

خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا: ———

"آج پچھلے پہر آپ اعلان کرتے ہوئے میرے گھر کے سامنے سے گذرے، میں سنکر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میرے گھر میں کوئی جوان نہیں تھا جس کے خون کی اسلام کی بارگاہ میں نذر پیش کرتی۔ چھ سال کا یہ یتیم بچہ ہے۔ جس کا باپ گذشتہ سال جنگ بدر میں جامِ شہادت سے سیراب ہوا۔ یہی کل میری متاعِ زندگی ہے، جسے سرکار کے قدموں پر نثار کرنے لائی ہوں۔"

حضرت بلال نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور سرکار کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ سرکار نے بچے کو آغوشِ رحمت میں لے لیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ پیار کیا اور نہایت شفقت کے ساتھ ارشاد فرمایا: ———

"میری رحمتوں کے محبوب شہزادے! تم ابھی کمسن ہو۔ میدانِ جنگ میں جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابھی تم اپنی ماں کی آغوش میں پلو۔ بڑھو اور گلشنِ شباب کی بہار بنو۔ جب تمہارے بازوؤں میں کس بل پیدا ہو جائے گا تو میدانِ جنگ تمہیں خود آواز دے گا۔"

بچے نے اپنی تتلائی ہوئی زبان میں کہا: ———

"یا رسول اللہ! میں نے اپنی امی جان کو دیکھا ہے، کہ جب وہ چولہا جلاتی ہیں تو پہلے چھوٹے چھوٹے تنکوں کو سلگاتی ہیں۔ جب آگ بھڑک اٹھتی ہے تو پھر موٹی موٹی لکڑیاں ڈالتی ہیں۔

یا رسول اللہ! میں جنگ کرنے کے قابل تو نہیں لیکن کیا میدانِ کارزار گرم کرنے کے لئے مجھ سے تنکوں کا کام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ اگر آپ مجھے اپنے

ہمراہ نہیں لے گئے تو میری امی روتے روتے ہلکان ہو جائیں گی ——— وہ اس غم میں ہر وقت روتی رہتی ہیں کہ آج میری گود میں بھی کوئی جوان بیٹا ہوتا تو میں بھی اسے اسلام کی نذر کر کے سرکار کی خوشنودی کا اعزاز حاصل کرتی۔"

جس معصوم ادا کے ساتھ بچے نے اپنی زبان میں دل کے حوصلوں کا اظہار کیا، سارے مجمع پر رقت طاری ہو گئی۔ سرکار بھی فرط اثر سے آبدیدہ ہو گئے۔

حضرت بلال سے فرمایا: ———

"جا کر اس بچے کی ماں سے کہہ دو کہ اس کی ننھی قربانی قبول کر لی گئی۔ قیامت کے دن وہ خاتون شہیدوں کی ماؤں کی صفوں میں اٹھائی جائے گی۔

آج سے خدا کی ایک مقدس امانت سمجھ کر وہ بچے کی پرورش کا فرض انجام دے گی۔ خدا کے یہاں بال بال کا اجر محفوظ رہے گا۔"

علامہ ارشد القادری

ذیل میں مشائخ اسلام اور ائمہ سلف کی مستند اور نایاب کتابوں سے مختلف موضوعات پر نہایت مفید اقتباسات اردو میں پیش کئے جا رہے ہیں

از: رشید قاری

۱۔ المنقذ من الضلال ——— تصنیف حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

طریقۂ اثباتِ نبوّت

مسئلہ نبوّت میں انسانی شکوک کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:۔

۱۔ نبوت کے امکان میں شک ہے۔

۲۔ نبوت کے موجود ہونے میں شک ہے۔

۳۔ کسی فرد خاص کے متعلق شک ہے کہ وہ منصب نبوت کا حامل ہے یا نہیں۔

پہلے شک کا جواب یہ ہے کہ نبوّت موجود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز موجود ہو اس کے امکان میں شک نہیں ہو سکتا۔

اب ہم سے یہ سوال کیا جائے گا کہ نبوت کے موجود ہونے کا ہمارے پاس کیا ثبوت ہے؟ تو اس سلسلے میں ہم یہ کہیں گے کہ دنیا میں کچھ ایسی بھی معلومات ہیں جن کا وجود عقل محض کی دریافت سے بالاتر ہے۔ جیسے علم طب اور علم نجوم کہ ابتداءً صرف عقل کے ذریعہ ان کا وجود متصور نہیں ہو سکتا لہٰذا ماننا ہوگا کہ ذریعۂ عقل کے علاوہ بھی معلومات کا ایک اور ذریعہ انسانوں کو دیا گیا ہے۔ اسی ذریعہ کو ہم نبوّت کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کی بنیاد

الہام اور وحی پر رکھی گئی ہے۔

اگر لوگوں کو خواب کے مفہوم کا ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوتا اور ان سے کہا جاتا کہ دنیا میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو ایک ایسے عالم سے اپنا رابطہ رکھتے ہیں جس سے دوسرے لوگ قطعاً نابلد ہیں تو انہیں یقین نہ آتا ___ اسی عالم کو ہم عالم غیب سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہی عالم نبوت کے معلومات کا مرکز ہے۔

پس ایسی چیزوں کی دریافت جو مدرکات عقل سے خارج ہیں۔ نبوت کے بہت سارے خواص میں سے ایک خاصہ ہے۔

ہم نے علم طب علم نجوم اور خواب کی جو مثالیں دی ہیں ان سے کوئی اختلاف بھی کرے تو کم از کم اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک سارے انسانوں میں قدر مشترک کے طور پر ایک ایسے عالم کا تصور رہا ہے جو ہمارے ظاہری حواس سے روپوش ہے اور جس کی دریافت سے عقل کی قوت ادراک بھی قاصر ہے ___

لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس عالم کا تصور انسانوں کو ان نفوس قدسیہ کے ذریعہ ہوا ہے جن کی معلومات کا ذریعہ الہام اور وحی ہے اور اسی کا نام نبوت ہے۔

یہ دلیل اصل نبوت کے وجود پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ کسی شخص خاص کے بارے میں شک ہے کہ وہ نبی ہے یا نہیں تو اس شک کے ازالہ کی سب سے مؤثر اور آسان صورت یہ ہے کہ اس شخص کے حالات و کوائف دریافت کئے جائیں۔

اس کے احوال کی معرفت یا تو خود اس کے مشاہدہ سے ہو سکتی ہے یا پھر متواتر سماعت کے ذریعہ۔ آج یہ دوسری ہی صورت ممکن ہے۔

مثال کے طور پر جب تم نبوت کے معنی سمجھ کر قرآن اور احادیث میں غور کرو گے تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ ہمارے پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے سب سے اونچے درجے پر فائز تھے۔

اور اس امر کی تائید اس طرح پر ہوگی کہ جب تم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث
پڑھوگے کہ عبادت و ریاضت سے دل کا تصفیہ ہو جاتا ہے اور تم اسے واقعات پر منطبق کرو
گے تو دنیا میں روشن ضمیر اور پاک باطن انسانوں کا ایک طبقہ دیکھ کر تمہیں پیغمبر کی سچائی کا
یقین ہو جائے گا۔

جب تم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ قول پڑھوگے کہ جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے
اللہ تعالیٰ اُسے ایسے علوم کا وارث بنا دیتا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا، جو شخص کسی ظالم کی مدد
کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ظالم کو اسی کے سر پر مسلط کر دیتا ہے۔ جو شخص صبح کو اس حال میں اٹھتا ہے
کہ سوائے فکرِ مولیٰ کے اُسے اور کوئی فکر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت کے تمام افکار
سے نجات دے دیتا ہے۔

جب تم ان اقوال کا تجربہ کرنے کے لئے عمل کے میدان میں قدم آگے بڑھاؤ گے تو
تمہیں فوراً محسوس ہو جائے گا کہ یہ اقوال صداقت و راستی کی برکتوں سے بھرے ہیں۔ اور
انسان کی فطرت اسی طرح واقع ہوئی ہے کہ قول کی سچائی رفتہ رفتہ قائل کی سچائی کا
یقین دلا دیتی ہے۔

اگرچہ معجزات و خوارق عادات بھی نبی کی شناخت میں معاون ہوتے ہیں لیکن شناخت
کا سب سے یقینی ذریعہ خود نبی کی وہ زندگی ہے جو لاکھوں زندگیوں کے درمیان ایک کھلا ہوا
امتیاز رکھتی ہے۔ اس کی وہ محیر العقول تعلیمات ہیں جن کے نتائج کا ہر رشتہ خدا حقیقت
سے مربوط ہوتا ہے

ہم سارے جہان کے منکرین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ انصاف کے ساتھ نبوت
کی سچائی کو پرکھنا چاہیں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور ان کی
گرانقدر تعلیمات کا کھلے دل سے مطالعہ فرمائیں۔ اور اسی کے وابستہ ہو جانے والوں
کی زندگیوں کا بھی مطالعہ کریں جنہوں نے اپنے آپ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کے اقوال و احوال کے سانچے میں ڈھال لیا تھا ـــــ ہر جگہ انہیں ایک نمایاں
امتیاز نظر آئے گا۔

کافی ہے۔ یہ ساری چیزیں اس امر کا یقین دلانے کے لیے بہت کافی ہیں کہ وہ خدا کا فرستادہ ہے اور اسی کی تائید و حمایت کے بل پر اس کی زندگی کی یہ ساری انفرادیت قائم ہے۔

لیکن ہم یہ دیکھ کر اور بھی حیران رہ جاتے ہیں کہ جہاں فہم و ادراک کی معنوی دنیا میں اس کی برتری کا پرچم لہرا رہا ہے وہاں وہ عالم محسوسات میں بھی فرماں روائی کے منصب پر ہے۔ جہاں سے چاہتا ہے اور جس وقت چاہتا ہے کائنات کے نظام طبعی میں تصرف کرتا رہتا ہے انہی تصرفات کو ہم معجزات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دلائل نبوت کے ضمن میں ان معجزات کی ایک اجمالی فہرست ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:۔

۱۔ صنادید قریش کی درخواست پر چاند کے دو ٹکڑے کر دینا اب تاریخ عالم کا ایک مشہور واقعہ بن چکا ہے۔ جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار بھی جانتے ہیں اور وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے۔

۲۔ چند کھجوروں، چند روٹیوں اور چند قطرہ ہائے آب کی قلت کو اتنی عظیم الشان کثرت میں تبدیل کر دینا کہ ایک بہت بڑے لشکر، ایک بے پناہ جم غفیر اور ایک عظیم مجمع کے لئے کافی ہو جائے یہ منصب نبوت ہی کا کرشمہ ہے۔

حضرت جابر اور حضرت ابوطلحہ کے گھروں پر خندق کے دن اور غزوہ تبوک اور حدیبیہ کے سفر میں اس طرح کے واقعات پیش آئے۔

۳۔ جنگ بدر میں ایک مشت غبار کا طوفان بن جانا اور لشکر اعداء کو اڑا لے جانا یہ بھی نبوت ہی کا ایک تصرف ہے۔

۴۔ سوکھے ہوئے کھجوروں کے جس تنے سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر جمعہ کے دن خطبہ دیا کرتے تھے اور اس کا صدمۂ فراق سے پھوٹ پھوٹ کر رونا اور حضور انور کا اپنے سینے سے لگا کر اسے تسکین دینا نباتات کے قالب میں ایک عاشق پرسوز کا دل منتقل کر دینا بھی نبوت کا ہی منصب ہے۔

۵۔ غیب کی وہ خبریں دینا جن کی دریافت سے عقل انسانی عاجز ہے، یہ بھی منصب نبوت ہی کا ایک خاصہ ہے۔

چنانچہ ذیل میں اس کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں :—

(الف)— حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یہ باغیوں کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کریں گے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

(ب)— جنگ بدر کے دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے سرداران قریش کے متعلق نام لے لے کر بتایا کہ فلاں یہاں قتل کیا جائے گا۔ فلاں کی لاش یہاں گرے گی۔ فلاں کا مقتل یہ ہے۔ حضور نے الگ الگ زمین پر خط بھی کھینچ دیا۔ چنانچہ جب جنگ ختم ہوئی تو لوگوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ جس کے متعلق جہاں قتل ہونے کی نشاندہی سرکار نے کی تھی وہ وہیں پر مقتول حالت میں پڑا ہے۔

(ج)— سرکار نے اپنے وصال شریف کے وقت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ خبر دی تھی کہ میرے اہل بیت میں تم سب سے پہلے میرے پاس آؤ گی۔ چنانچہ حضور کے وصال کے بعد سب سے پہلے حضرت سیدہ کا وصال ہوا۔

(د)— ایک دن حضور کی ازواج مطہرات نے حضور سے دریافت کیا کہ آپ کے وصال شریف کے بعد ہم میں سے کون سب سے پہلے آپ سے ملے گا۔ حضور نے جواب مرحمت فرمایا کہ تم میں سے جس کا ہاتھ سب سے زیادہ لمبا ہے وہی میرے پاس آنے والوں میں سبقت کرے گا۔ ہاتھ کی لمبائی سے سرکار کی مراد سخاوت و فیاضی تھی۔ چنانچہ حضرت زینب بنت جحش جو ساری ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ سخی اور فیاض تھیں حضور کے وصال شریف کے بعد ازواج میں سب سے پہلے ان ہی کا وصال ہوا۔

(نوٹ)— اس واقعہ میں خاص طور پر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج طیبات کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ حضور کو اس بات کا علم ہے کہ کون کب انتقال کرے گا۔ اگر ان کا یہ عقیدہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز اپنے متعلق اس طرح کا سوال نہ کرتیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ حضور نے بھی جواب مرحمت فرما کر ان کے اس عقیدے کی

توضیح فرما دی، ورنہ اس طرح کا عقیدہ کہ خلافِ حق اور شرک ہوتا تو حضور اپنی ازواج
طاہرات کو ضرور متنبہ فرماتے کہ کب کس کی وفات ہوگی اس کا علم مجھے نہیں دیا گیا
ہے میرے متعلق اس طرح کا عقیدہ نہ رکھو۔

(۸) — ہجرت کے موقع پر حضرت سراقہ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ وہ سرخ اونٹ کے
لالچ میں حضور کو گرفتار کرنے کے لئے ان کے تعاقب میں نکلے کئی بار ایسا موقعہ آیا کہ وہ
حضور کے قریب پہونچ گئے اور کمند ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ حضور نے اشارہ کیا اور وہ
زمین میں دھنس گئے۔ حضور نے فرمایا کہ سراقہ! میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کا
کنگن دیکھ رہا ہوں یعنی تمہارے حق میں سلطنت ایران کی دولت مقدر ہو چکی ہے
تم تقدیر الٰہی سے جنگ نہ کرو — چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ خلافت فاروقی میں جب ایران
فتح ہوا تو مال غنیمت میں کسریٰ کے کنگن بھی آئے تھے۔ اور وہ حضرت سراقہ کو پہنائے
گئے — حضرت سراقہ کو حضور کے اس فرمان کا اتنا یقین تھا کہ ایک بار وہ سخت بیمار
ہو گئے، حالت نہایت سنگین ہو گئی لیکن — لوگوں سے وہ کہتے تھے کہ مجھے اس وقت
تک موت نہیں آئے گی جب تک کسریٰ کا کنگن میری کلائی میں نہ پڑ جائے۔

(۹) — جنگ خیبر کے موقع پر صحابہ کرام نے حضور کے سامنے ایک سپاہی کا تذکرہ کیا جس
نے اس دن نہایت بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ حضور نے اس کے
متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ جہنمی ہے۔ صحابہ کرام کو سخت حیرت ہوئی۔ لیکن چونکہ حضور
کا یہ فرمان تھا اس لئے انھیں یقین تھا کہ سرکار نے سچ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ اس
سپاہی کے پیچھے لگ گئے۔ اسے میدان جنگ میں کئی جگہ نہایت کاری زخم آئے تھے
جس کی ٹیس سے وہ بے چین تھا۔ جب اس سے نہیں رہا گیا تو شدت کرب میں
جنگل کی طرف بھاگا اور وہاں پہونچ کر خودکشی کر لی — یہ منظر دیکھ کر صحابہ کرام نے
حضور کی صداقت کا نعرہ بلند کیا۔

(نوٹ — یہاں تک سرکار کی غیب دانی سے متعلق چند واقعات کی طرف اشارہ
تھا۔ اب حضور کے معجزات کے بیان کی طرف چلتے ہیں —

۶ — ہجرت کی شب میں قبائل کفر کے سردار مانند سے حضور کے کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کئے کھڑے تھے سب کے ہاتھوں میں زہر کی بجھی ہوئی ننگی تلواریں تھیں لیکن پیغمبر ان کی پلکوں کے نیچے سے نکل گئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی آنکھوں کی بصارت پر اس طرح پردہ ڈال دینا کہ سینکڑوں آدمی کھلی آنکھوں سے دیکھیں اور کوئی نہ دیکھ سکے۔
یہ امر محسوسات کا نہایت حیرت انگیز تصرف ہے

۷ — متعدد روایتوں سے اس طرح کے واقعات منقول ہیں کہ میدان جنگ میں بعض بعض صحابہ کو ایسا زخم پہنچا کہ آنکھیں باہر نکل آئیں، وہ اپنی آنکھ کا ڈھیلا ہاتھ میں لئے ہوئے سرکار کے پاس فریاد کرتے ہوئے آئے حضور نے وہ ڈھیلا لے کر پھر آنکھ کے حلقے میں اپنی جگہ پر رکھا اور اپنا ہاتھ اس پر پھیر دیا، دست انور کے مس ہوتے ہی آنکھ اپنی اصل حالت پر آگئی۔

آنکھ سے باہر ہو جانے والے ڈھیلے کو اسی طرح پھر آنکھ کے اندر واپس کر دینا اور اسے پہلی طرح صحیح و سالم بنا دینا یہ علم محسوسات کا کھلا ہوا تصرف ہے۔

۸ — عرب میں حکم ابن عاص نامی ایک نہایت گستاخ شخص تھا۔ ایک دن وہ حضور کے خرامِ ناز کی نقل اتارنے کے لئے عجیب طرح سے لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگا، وہ اپنی چال بگاڑ کر یہ سمجھتا تھا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل اتار رہا ہے۔ بس یہ چال ٹھہر ہی کر رہ گئی۔ چنانچہ جس انداز سے ٹیڑھا ہو کر چل رہا تھا اسی حالت سے وہ باہر نہیں نکل سکا اور مرتے دم تک اسی طرح ٹیڑھا ہو کر چلتا رہا۔ — لوگ اسے دیکھتے تھے تو خدا کی پناہ مانگتے تھے۔

اسے زندگی بھر وہ قہر خداوندی کے عتاب کا ایک چلتا پھرتا نشان تھا۔

۹ — مدینہ طیبہ میں جمرہ نامی ایک شاعر تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جس کا نام ام شبیب تھا حضور نے اس کے لئے اس کے باپ کے پاس نکاح کا ایک پیغام بھیجا۔ پیغام سن کر اس کا باپ سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ میری بیٹی برص کی بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس لئے جب تک وہ اچھی نہ ہو جائے ہم اس کے

لئے کوئی پیغام قبول کرنے کے قابل نہیں ہیں ـــــ

نبی کی جناب میں اس غلط بیانی پر ذرا قہرِ الٰہی کی مار دیکھئے کہ جونہی وہ پلٹ کر اپنے گھر واپس لوٹا بیٹی سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ جب جو نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو سر سے لے کر پاؤں تک سارا بدن برص کے داغ سے سفید ہو گیا ہے ــــ ساری زندگی وہ اسی حالت میں سڑتی رہی مارے بدبو کے اس کے قریب کوئی بھی نہیں جاتا تھا ـــــ

ذرا سی بے ادبی پر عبرتناک سزائیں کیا اس یقین کے لئے کافی نہیں ہیں کہ نبی کی شخصیت کا اعزاز تمام انسانوں کی سطح سے بہت اونچا ہے اور اس طرح کی برتری منصبِ نبوت ہی کو زیب دیتی ہے ــــ

۱۰ احادیث میں اس طرح کے واقعات کی متعدد روایتیں ہیں کہ حضور نے کھانا ہاتھ میں لیا اور تسبیح کی آواز کانوں میں آنے لگی۔ پھر برتن میں رکھ دیا آواز بند ہو گئی۔

راستہ چلتے ہوئے کہ راستے میں سے درختوں اور پتھروں سے صلوٰۃ و سلام کی آوازیں آتی ہیں پلٹ کر دیکھا تو سنگریزے سلام عرض کر رہے ہیں۔

ایک یہودیہ عورت کے متعلق یہ روایت ہے۔ [illegible] نے بھونا ہوا اور مسموم بکری کے گوشت میں زہر ملا دیا تھا کہ حضور کو گزند پہنچے لیکن [illegible] گوشت کی ہڈی نے حضور کو یہ خبر دی کہ اس گوشت میں زہر ملا ہوا ہے

حضور نے ایک دن حضرت مولا علی، سیدہ فاطمہ اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اپنی کملی میں چھپا کر دعا فرمائی۔ دعا کے اختتام پر دروازوں کی چوکھٹ اور دیواروں نے بآوازِ بلند آمین کہا۔

۱۱ ـــ عام محسوسات کے یہ کھلے ہوئے تصرفات منصبِ نبوت کی بہترین نشانیاں ہیں لیکن حضور کی پیغمبرانہ عظمت کی سب سے عظیم و جلیل نشانی اللہ کی کتاب ہی ہے۔ سرکار کا یہی وہ تنہا معجزہ ہے جو آج تک اپنی اصل حالت میں انسانوں کے درمیان موجود ہے۔

قرآن کا سب سے روشن کمال یہ ہے کہ ہر دور میں ہر جگہ کے دانشوروں نے اپنی زندگی کا دستور العمل بنایا اور ظروف و احوال اور مزاج و طبائع کے گوناگوں اختلافات کے

اور اس کے تمام فرشتے مدنی محبوب پر درود بھیجتے ہیں

دوسری بات یہ ہے کہ ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تم بھی مدنی محبوب پر درود و سلام بھیجو۔

حدیث میں ہے کہ یہ آیت کریمہ جب نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے حضور سے دریافت کیا۔ جہاں تک سلام کا تعلق ہے اس کا طریقہ تو ہم جانتے ہیں ابتدا [illegible] سے سکھائی گئی ہے اس لئے ہمیں نہیں معلوم کہ درود بھیجنے کا طریقہ کیا ہے۔

سرکار نے انہیں درود کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یوں کہو:——

اللھم صل علی سیدنا محمد۔	اے اللہ! ہمارے سردار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نازل فرما۔

آیت کا ترجمہ اور اس کے ضروری متعلقات کو سمجھ لینے کے بعد اب ذیل کی بحث کو ملاحظہ فرمایئے:——

پہلی بحث

خداوند قدوس نے بندوں کو حکم دیا —— نبی پر درود بھیجو —— بندوں نے اس حکم کی تعمیل یوں کی —— اے خدا! تو نبی پر درود بھیج۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تعمیل ہوئی یا بات الٹ دی گئی۔

پھر اسی آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا اپنے نبی پر درود بھیجتا ہے —— اب یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ جب خداوند اپنے نبی پر درود بھیجتا ہی ہے تو بندوں سے یہ کہلوانا کہ اے خدا! تو اپنے نبی پر درود بھیج، کیا دوسرے لفظوں میں تحصیل حاصل نہیں ہے ——؟ کیونکہ بندے نہ بھی درود بھیجنے کی التجا کریں جب بھی وہ درود بھیجتا ہے بھیجتا رہے گا پھر آخر اس کہنے کا مدعا کیا نکلا ——؟

پہلے سوال کا جواب

یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ لفظ درود کا مفہوم سامنے نہیں ہے۔ ورنہ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتا کہ بات الٹی نہیں گئی ہے نہایت واضح لفظوں میں اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کیا گیا ہے۔

"درود" سے یہاں جو معنی مراد لئے گئے ہیں وہ ہے رفعت شان کا اہتمام

[illegible]

پہلا سبب — حسن و زیبائی — دوسرا سبب — رشتۂ قرابت

تیسرا سبب — سخاوت و عطا — چوتھا سبب — مشکل کشائی

پانچواں سبب — فضل و کمال — چھٹا سبب — [illegible]

فطرت انسانی موجودات میں سے کسی بھی موجود سے مذکورہ بالا اسباب کے زیر اثر محبت کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فطرت انسانی کا یہ تقاضا بدل جائے۔

پس میں تمام اہل نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ پوری دیانتداری کے ساتھ میرے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود میں محبت کے مذکورہ بالا اسباب و محرکات کا ہجوم ملاحظہ فرمائیں — اب میں الگ الگ سبب پر تھوڑی سی روشنی ڈالوں گا۔

حسن و زیبائی اس پیکر جمیل کے حسن و زیبائی کا کیا کہنا! جس نے ایک نظر دیکھ لیا شیفتہ ہو گیا۔ حسن یوسف کی چہار دانگ عالم میں شہرت ہے لیکن وہ خود سرکار کے نمکدان حسن سے ملاحت کی بھیک مانگتا ہے۔ دیکھنے والے گواہ ہیں کہ سرکار سے بڑھ کر کوئی حسین و جمیل اس وقت تھا، نہ پیدا ہوا، نہ پیدا ہوگا۔

چاندنی رات میں سرکار کے چہرۂ جمال کا ایک عینی شاہد بیان کرتا ہے کہ حضور کی صورت و زیبائی کے آگے چودھویں رات کا چاند بھی ماند تھا

رشتۂ قرابت خون اور نسب کا رشتہ پھر بھی رگ جاں سے قریب نہیں ہے۔ لیکن میرے آقا کا قرب رگ جاں سے بھی زیادہ ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ نبی تمہاری جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے پیرایۂ محسوس میں قرآن نے اپنے محبوب کے اس رشتۂ قرب کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ سرکار کی پاک بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

بلکہ بعض عرفا نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حضور سارے مسلمانوں کے معنوی اور روحانی باپ ہیں

جب حضور جان سے بھی زیادہ قریب ہیں تو اب اس سے زیادہ قریب کون سا رشتہ متصور ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رشتے کے سامنے سارے رشتے ٹوٹ گئے

سخاوت وفیاضی

یہ وصف جمیل بھی سرکار کے اندر علیٰ وجہ الاتم موجود تھا، بلکہ تھا نہیں آج بھی ہے۔ سرکار خود ارشاد فرماتے ہیں کہ — اللہ دیتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں — دنیا میں جتنے سخی اور فیاض ہیں انہیں بھی جو کچھ ملا ہے یا ملتا ہے یا ملے گا ذریعہ کے طور پر سرکار ہی کا دست کریم درمیان میں ہے۔

حضور کی سخاوت وفیاضی کے محیر العقول واقعات آج بھی کتابوں میں موجود ہیں۔ خود فاقے سے رہے لیکن دوسروں کو آسودہ رکھا۔ ان کے بارہ میں زبان کھولنے کی بھی ضرورت نہیں بے مانگے ملتا تھا۔ اور بلاشبہ آج بھی سرکار اپنے حریم اقدس سے سارے جہان کو سیراب فرما رہے ہیں۔

مشکلکشائی

اس وصف میں بھی حضور سارے جہان میں بے مثال و یکتا ہیں۔ دنیا میں آپ کے چشم کرم سے مشکلات کی جو گرہیں کھلتی ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا ہے ہر شخص اپنے معاملات میں اپنے تئیں اسے جانتا ہے۔ اس عالم کی بات کر رہا ہوں جہاں سوائے سرکار کے اور کسی کا عالم ہی نہیں ہے، وہاں قبر سے لے کر حشر تک حضور کی مشکلکشائی کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں، بات طویل ہو جائے گی ورنہ میں تفصیل سے بتاتا کہ قبر میں کس طرح سرکار اپنے حیران و متوحش غلاموں کی مشکلکشائی اور دستگیری فرماتے ہیں۔ اور کل عرصۂ محشر میں جبکہ نسل انسانی مایوسی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو رہی ہوگی، عالم کرب میں سرکار کس طرح عقدہ کشائی فرمائیں گے۔

فضل وکمال

انسانوں کا یہ وصف خدا ہی کا عطیہ ہے لیکن میرے [illegible] میں قرآن کہتا ہے کہ [illegible] — [illegible]

[illegible]

خود اس کے فضل و کمال کا کون اندازہ لگا سکتا ہے

محبّت

سرکار کو اپنی امت سے کیسی محبت تھی اس کے متعلق کچھ زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے حجرۂ عائشہ سے کر صحرائے مدینہ کی تنہائیوں تک ایک ایک ذرہ شاہد عدل ہے کہ حضور کے نزدیک اپنی امت سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہیں تھی ہجرت سے لے کر عالم نزع تک خوشی اور کرب کے کسی مرحلے پر بھی امت محمدیہ کو فراموش نہیں فرمایا یہاں تک کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ——

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى.

آپ کا رب آپ کو اتنا دیگا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

تو حضور نے فرمایا ——

اِذًا لَا اَرْضٰى وَوَاحِدٌ مِنْ اُمَّتِىْ فِى النَّار

میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک میرا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوگا

محبوب کے اس ناز کے پیچھے جھانک کر دیکھو تو رحمت و محبت کا ایک دریائے ناپیدا کنار موجزن ہے۔

اب عقل و نقل اور عادت و فطرت کے تمام تقاضوں کو سامنے رکھ کر انصاف سے بتاؤ کہ محبت کے سارے اسباب و محرکات ایک ساتھ جس پیکر وجود میں مجتمع ہو گئے ہیں آدمی اس سے محبت نہیں کرے گا تو کس سے کرے گا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس محبت کرنے کا معاملہ اس معنی کر ضرور بہتر ہے [illegible] اختیار سے باہر ہے کہ ان اسباب و محرکات کی موجودگی میں کوئی قدرت نہیں رکھتا کہ اپنے آپ کو اس پرستش و شیدائی سے روک سکے ——

فتبارک اللہ احسن الخالقین

○

آیا تو تم نے اسے ذبح کر کے کھا لینا چاہا؟ ——— وہ بولے: یا رسول اللہ! یہ ٹھیک ہی ہے بالکل ایسا ہی واقعہ ہوا۔

پھر حضور نے ارشاد فرمایا کہ نیک سلوک کا بدلہ اس کے مالکوں کی طرف سے یہ نہیں ہے ——— وہ بولے: تو یا رسول اللہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم نہ اسے ذبح کریں گے نہ اسے بیچیں گے ——— فرمایا: غلط کہتے ہو اس نے تم سے فریاد کی تو تم اس کی فریاد کو نہ پہنچے اب میرے پاس یہ اپنی فریاد لایا ہے تو میں زیادہ مستحق ہوں کہ اس کی فریاد کو پہنچوں اور اس پر ترس کھاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت تو منافقین کے دل سے نکال لی ہے اور اہل ایمان کے قلوب میں اسے بھر دیا ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اونٹ سو روپے میں مالک سے خرید لیا اور اس سے ارشاد فرمایا: اے اونٹ! چلا جا تو اللہ عزوجل کے لئے آزاد ہے۔ یہ سنکر وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ اور حضور کے گوش مبارک کے قریب اپنا منہ لے جا کر تین بار ایک عجیب آواز نکالی، ہر بار حضور نے آمین کہی۔ چوتھی بار حضور آبدیدہ ہو گئے۔

صحابہ نے دریافت کیا حضور! اس نے اپنی زبان میں کیا کہا ہے؟ فرمایا پہلی بار اس نے یہ دعا کی کہ ——

یا نبی اللہ! اسلام و قرآن کی طرف سے خدا آپ کو بہتر جزا عطا کرے۔ میں نے کہا آمین پھر اس نے کہا اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن آپ کی امت سے بھی اسی طرح خوف دور کر دے جس طرح آج آپ نے میرا خوف دور کیا ہے۔ میں نے کہا آمین۔

پھر اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کی امت کا خون ان کے دشمنوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے (یعنی وہ انہیں دنیا سے فنا نہ کر سکیں) جس طرح آپ نے میرا خون محفوظ فرما دیا۔ میں نے کہا آمین۔

پھر اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو باہمی خونریزی سے بچائے۔ اس پر مجھے رونا آ گیا کیونکہ یہ سب مرادیں میں بھی رب سے مانگ چکا ہوں۔ سب مرادیں قبول ہوئیں لیکن پچھلی مراد مانگنے سے مجھے روک دیا گیا اور حضرت جبرئیل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدا کا یہ پیغام پہنچایا کہ قلم چل چکا ہے کہ میری امت خود اپنی ہی تلوار سے فنا ہو گی۔

آج سرکار کے ایک چہیتے صحابی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایک پروانہ اس شمعِ نور سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا جس کی روشنی کی قندیل کا چراغ ہر وقت فروزاں رہتا تھا۔ مدینے کے چمنستانِ کرم میں اب بھی ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے لیکن عندلیبانِ چمن کے فروغِ محبت کا یہ حال تھا کہ صرف ایک پھول مرجھا گیا تھا تو ہر طرف سوگوار اداسیوں کی شام ہو گئی تھی۔

بھیگی بھیگی پلکوں کے سائے میں جنازہ اُٹھا تو غمگساروں کے اژدحام سے گلیوں میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں تھی۔ خود کائناتِ ہستی کے سرکارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے ایک شیدائی کی مفارقت سے بہت زیادہ غمگین و آبدیدہ تھے۔

مدینے کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں جب لوگ جنازہ لے کر پہنچے تو لحد تیار ہو چکی تھی۔ جنازہ اتارنے کے لئے سرکار خود بنفسِ نفیس لحد میں تشریف لے گئے اور اپنے نورانی ہاتھوں سے جنازہ کو فرشِ خاک پر لٹایا —— سرکار کی اس ادائے رحمت پر ہر شخص مچل کے رہ گیا کہ کاش مرنے والے کی جگہ پر ہم ہوتے اور سرکار کے قدسی ہاتھوں سے ہماری نعش سپردِ خاک کی جاتی۔ عالمِ گیتی کے مسافر کو گلشنِ جنازہ کی سیر کے لئے اپنی خوابگاہ سے دو قدم بھی نہیں چلنا پڑا۔ جنت کی ساری بہاریں مرقد ہی میں سمٹ آئیں۔ جس کی لحد میں جنازہ سے پہلے رحمتِ یزدانی اتر آئی ہو۔ آخر اس پہ رشک نہ کیا جائے تو اس بھری کائنات میں اس سے زیادہ اور کون قسمت کا دھنی ہو سکتا تھا! مراسمِ تدفین سے فارغ ہو کر سرکارِ کائنات کاشانۂ اقدس کی طرف واپس ہوئے۔ جونہی دولت سرائے اقبال میں قدم رکھا، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حاضرِ خدمت ہوئیں اور نشاطِ قلب [illegible]
[illegible] مقدم کیا۔

بیتابِ آرزو

مدینے سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اُحد کے میدان میں آج حق و باطل کا زبردست معرکہ تھا — دنیائے کفر کے سارے سورما آہن و فولاد کے مہیب ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

اُدھر سارے قبائل میں شور تھا کہ آج مدینے کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور صفحۂ ہستی سے اسلام کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا جائے گا۔

اِدھر مدینے میں جذبات کے ہیجان کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کو رات کاٹنی مشکل ہو گئی۔ جونہی سویرا ہوا، چمکتی ہوئی تلواروں کی جھنکار سے کوچہ و بازار گونج اٹھے۔

ہر جوان سر بکف، ہر بچہ کفن بدوش، ہر عورت دست بدعا اور ہر بوڑھا شوقِ شہادت میں سرشار نظر آ رہا تھا۔

رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ جو پاؤں سے لنگڑے تھے، وہ بھی محاذِ جنگ پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

لوگوں نے ہزار سمجھایا کہ تم معذور ہو، چلنا پھرنا مشکل ہے تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟ تمہارے چار بیٹے تو جا ہی رہے ہیں اب تمہارے ذمہ اسلام کا کون سا حق باقی رہ جاتا ہے۔

انھوں نے جذبات سے بیخود ہو کر جواب دیا:

"اسلام کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے، اسلام کا حق یہ بھی ہے کہ کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے میری رگوں کا سارا خون مقتل کی خاک میں جذب ہو جائے اور میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیے جائیں۔

میرے لئے کتنی بڑی محرومی کی بات ہے کہ میرے بیٹے تو جنت میں پہنچ

ہے۔ آؤ مجھے گھائل کرو۔ میں زخمی ہو کر تڑپنا چاہتا ہوں۔ دشمنانِ حق کے لہو سے میں اپنی تلوار کی پیاس بجھا چکا ہوں۔ اب میں خود سیراب ہونا چاہتا ہوں۔ بس ایک جام کوثر کا انتظار ہے۔

اسی عالم شوق میں مچلتے، کڑکتے، سینہ تانے، رجز پڑھتے، آواز لگاتے، چلے جا رہے تھے کہ ایک زہر میں بجھا ہوا تیر آیا ان کے جگر میں پیوست ہو گیا۔

گھائل ہو کر گر پڑے۔ رگوں کا سارا خون مقتل کی خاک میں جذب ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے تڑپے۔ اور بے ہوش ہو گئے۔

قریب جا کر دیکھا تو روح اس دنیا میں نہیں تھی فردوس کی سرزمین پر چہل قدمی کر رہی تھی۔

شہادت کا مشتاق کوثر کا جام خالی کر چکا تھا اور جنت کا شیدائی "دختران قدس" کے جھرمٹ میں مسکرا رہا تھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرو بن جموح کی اہلیہ شہادت کی خبر پا کر میدان احد میں آئیں۔

چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا: ——

"عمرو! تمہیں سرمدی نعمتوں کی یہ سرخروئی مبارک ہو۔ حسینانِ فردوس کی انجمن میں مجھے بھول نہ جانا پیارے اسی کے لئے دروازے تک میں نے تمہیں رخصت کیا تھا۔

مجھے اپنی بیوگی کا غم نہیں، تمہاری شہادت کی خوشی ہے۔ خدا اسی خوشی کو سلامت رکھے۔"

یہ کہہ کر بھیگی پلکوں کے سائے میں انھوں نے اپنے اونٹ کو بٹھایا۔ اور جنت البقیع میں دفنانے کی غرض سے شوہر کی لاش کو اس پر بار کیا۔ جونہی اونٹ کی مہار پکڑ کر مدینے کی طرف بڑھیں کہ اچانک اونٹ بیٹھ گیا۔ ہزار کوشش کی لیکن اونٹ اپنی جگہ

سے نہیں ہلا۔

دوڑی ہوئی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا ماجرا بیان کیا۔

حضور نے ارشاد فرمایا: ———

"اونٹ کو یہی حکم ہے وہ تقدیر الٰہی سے سرتابی نہیں کرے گا — چپکے چپکے کیا دم رخصت عمرو بن جموع گھر سے کچھ کہہ کر چلے گئے تھے؟"

عرض کیا: ———

ہاں! قبلہ رو ہو کر یہ دعا مانگی تھی: ———

اَللّٰھُمَّ لَا تُعِدْنِیْ اِلٰی اَھْلِیْ۔ | یا اللہ مجھے اپنے اہل و عیال میں پلٹ کر نہ لا۔

ارشاد فرمایا: ———

"ان کی دعا قبول ہو گئی۔ اب ان کی لاش مدینے واپس نہیں جا سکتی۔ انہیں یہیں دفن کر دو۔ میں انہیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جنت میں مسکراتے ہوئے چل رہے ہیں"

؎ تیری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحد عقل سے گذرے تو یہاں تک پہنچے

آج بھی اُحد کی وادی میں یہ آواز کبھی کبھی سنائی دیتی ہے — میدان جنگ سے جنت کا فاصلہ بس ایک قدم ہے۔ آخرت کے مسافروں پر اس سے زیادہ قریبی مسافت کی کوئی راہ آج تک نہیں کھلی۔

چند روزہ زندگی کے معاوضہ میں دائمی زندگی کا کاروبار یہیں سے ہوتا ہے۔

علامہ ارشد قادری

نصف النہار پر پہونچ گیا تو ماں نے ایک دن بیٹے کے سامنے اس آرزوئے شوق کا اظہار کیا —

"میرے ارمانوں کے شگفتہ پھول! تمہاری شادی کے لئے قبیلے کے ممتاز گھرانوں سے بہت سے پیغامات آرہے ہیں۔ اجازت دو تو کوئی مناسب پیغام منظور کر لوں۔"

بیٹے نے ماں کے قدموں کا بوسہ لیتے ہوئے جواب دیا: ————

"میری زندگی کو اسیر شوق بنانے کے لئے وہی زنجیر بہت کافی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اب دل کا کوئی گوشہ التفات غیر کے لئے خالی نہیں ہے۔ چراغ قدس کے پروانے کو اسی شبستان میں رہنے دو ماں! جب دونوں جہان کی فراغت نصیب ہے بے نیام تلواروں اور لالہ کی طرح سرخ میدانوں سے زندگی کی رفاقت کا عہد کرنے والوں کو اب اور کسی عہد و پیمان کی ضرورت نہیں۔ جانے شہنشاہ کونین کا منادی کب آواز دیدے۔ کسی کو کیا معلوم! ایک مخلص مجاہد کو ہر وقت گوش بر آواز رہنا چاہیئے۔"

ماں نے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا: ————

"لیکن بیٹا! رشتۂ ازدواج بھی تو اسی شہنشاہ کونین کی سنت ہے جس کے حکم پر گوش بر آواز رہنے کے لئے تم زندگی کی فراغت چاہتے ہو۔ شاید تمہیں اس کی خبر نہ ہو کہ تمہارے اسی موسم حیات کی بہار دیکھنے کے لئے میں نے کتنی صعوبتوں کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا ہے۔ اور کتنے ہی آگ کی بھٹی میں سنگ گراں سے اپنی محبوب امیدوں کو مرنے سے بچایا ہے۔

اپنی زندگی کی فصل بہار پر میرے مقدس ارمانوں کا کچھ بھی حق تسلیم ہو تو اجازت دو کہ میں تمہاری پیشانی پر مسرت و شادمانی کا ایک مہکتا ہوا چمن آباد کر دوں —"

فیروز مند بیٹے نے سپردگی کے انداز میں سر جھکاتے ہوئے جواب دیا: ————

"اب میرے اندر مزید انکار کی جرأت نہیں ہے۔ مادر مشفقہ کی خوشی

کہ احترام میں سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ آپ کی آنکھیں جس طرح بھی ٹھنڈی ہو سکیں میری طرف سے اجازت ہے۔“

چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد قبیلے کے ایک معزز گھرانے کا رشتہ منظور کر لیا گیا۔ حنظلہ جیسے شکیل و خوبرو نوجوان کو پا لینے کے لئے جہاں بہت سے ارمانوں کا خون ہوا، وہاں ایک آرزو پروان چڑھی اور قبیلے کی سب سے حسین و جمیل دوشیزہ حضرت حنظلہ کے لئے منتخب کر لی گئی۔ بالآخر ایک خوشگوار شام کو نشاط و سرور کی پُرنور فضا میں حضرت حنظلہ دولہا بنا دئے گئے۔ اور نہایت سادگی کے ساتھ عقدِ نکاح کی رسم ادا کی گئی۔

آج شادی کی پہلی رات تھی۔ دو دھڑکتے ہوئے دل جذبۂ شوق کے یکساں عالم میں داخل ہو رہے تھے۔ پہلی بار ایک پارسا نوجوان کی نگاہ حسنِ زیبائی کی نکھری ہوئی چاندنی میں خیرہ ہو کے رہ گئی تھی۔ ہر طرف ارمانوں کے ہجوم کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ وہ عفت مآب دلہن کی ملاقات کا منظر کیا تھا۔ کون بتائے؟

البتہ تاریخ کے توسط سے اتنا سراغ ضرور مل سکا کہ رات بھیگ جانے کے بعد پسِ دیوار اچانک کسی منادی کی آواز فضا میں گونجی اور حضرت حنظلہ چونک اٹھے۔ نشاط و طرب کے شوق انگیز لمحوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ چہرے پر ایک گہرے تجسس کا نشان ابھرا اور شدتِ اضطراب کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ دیوار سے کان لگا کر اعلان کے الفاظ کو دوبارہ غور سے سنا۔

دربارِ رسالت کا منادی آواز دے رہا تھا: ———

”کفر کی یلغار اسلام کی فصیل کی طرف بڑھتی آ رہی ہے۔ ناموسِ حق کے پروانے بغیر کسی مزید انتظار کے رسالت کی سرکار میں حاضر ہو جائیں۔ مجاہدینِ اسلام کا صف شکن دستہ تیار کھڑا ہے۔ سپیدۂ سحر کی نمود سے پہلے پہلے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو جائے گا۔“

اعلان کے الفاظ سینے میں ترازو ہو گئے۔ اب حضرت حنظلہ اپنے آپ میں نہ تھے،

یہ کہتے ہوئے حضرت حنظلہ گھر سے باہر نکل پڑے۔ جب تک نظر آتے رہے عقیدت بھری نگاہ اُٹھتے ہوئے قدموں کا بوسہ لیتی رہی۔

رات کے پچھلے پہر جاں نثاروں کا لشکر دیوانوں کے ہجوم میں معرکۂ کارزار کی طرف روانہ ہوگیا۔ جانِ رحمت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ناقۂ مبارک پر سوار تھے۔ پیچھے پیچھے پروانوں کی قطار چل رہی تھی۔ سرکار کے رُخِ زیبا کی تنویر سے مجاہدین کے سینوں میں نمایاں شوکتوں کا چراغ جل اٹھا تھا۔

میدانِ جنگ میں پہونچ کر مرکزِ رشدِ اسلام کی صفیں آراستہ ہوگئیں۔ کفار کے لشکر نے بھی اپنا مورچہ سنبھال لیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت جیسے جنگ بجتے ہی گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ کی تلوار بجلی کا شرارہ معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے بے دریغ حملوں سے لشکرِ باطل میں ہر طرف ایک شورِ قیامت برپا تھا۔

حضرت حنظلہ کی پیاسی روح چشمۂ کوثر کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جام و مینا سے اب چند ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا، زہر میں بجھا ہوا ایک تیر ان کے جگر میں آکر پیوست ہوگیا۔ ابلتے ہوئے فوارے سے سارا پیرہن رنگین ہوکے رہ گیا۔ جب تک رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی تھا کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے فولاد کی دیوار بن کر کھڑے رہے۔ جب رگوں کی آگ بجھ گئی تو گھائل ہوکر زمین پر گر پڑے۔ اور چند ہی لمحوں میں روح جسم سے جدا ہوکر پرواز کرگئی۔

دوپہر ڈھلتے ڈھلتے کفار میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کو کھلی ہوئی فتح نصیب ہوئی ــــ جنگ ختم ہوجانے کے بعد جب زخمیوں کو اٹھایا گیا اور شہیدوں کی لاشیں جمع کی گئیں تو حضرت حنظلہ کی تلاش شروع ہوئی۔ ان کی گمشدگی پر سارے لشکر کو حیرت تھی جب وہ کہیں نہ ملے تو سرکار کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچائی گئی ــــ حضور نے چند لمحے

توقف فرمانے کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا:—

" حنظلہ کی لاش کو عالم بالا میں فرشتے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہاں انھیں غسل دیا جا رہا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش سامنے موجود تھی۔ بال بھیگے ہوئے تھے۔ خون آلود پیراہن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے—— مدینہ پہنچ کر جب گھر والوں سے ان کے حالات دریافت کئے گئے تو معلوم ہوا کہ رات کو گھر سے چلتے وقت ان پر غسل جنابت فرض ہو چکا تھا۔ اضطراب شوق نے فرض اتارنے کی بھی انھیں مہلت نہیں دی غسل جنابت کا وہ فریضہ عالم بالا میں فرشتوں کے ذریعہ اتارا گیا۔ اسی دن سے حضرت حنظلہ کا لقب بارگاہِ رسالت سے "غسیل ملائکہ" قرار پایا——

زندہ باد! اسلام کے قابلِ رشک فرزند زندہ باد!

علامہ ارشد القادری

(۱)

آج ہجرت کی رات تھی۔ سارے قبیلے کے نمائندہ کفر تیغ بے نیام لئے انتظار میں کھڑے تھے اس رسولِ رحمت کے انتظار میں جو انھیں ہلاکت و تباہی کے دہانے سے آسائش و امن کی ٹھنڈی چھاؤں میں واپس لانا چاہتا تھا۔ اچانک پچھلے پہر کاشانۂ نبوت کا دروازہ کھلا ایک کرن چمکی اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ خدا کا حبیب مسکراتا ہوا باہر نکلا اور تلواروں کے سائے سے گزر گیا۔ سحر کے اجالے میں صحرائے کفر کے خونخوار درندے جب دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے تو یہ معلوم کر کے حیرت سے وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے کہ پیغمبر ان کی پلکوں کے نیچے سے گزر گیا اور انھیں خبر تک نہیں ہوئی۔ ہزار تیاریوں کے باوجود زہر میں بجھی ہوئی تلواروں کا مصرف حاصل نہیں ہو سکا۔ قبائلِ عرب کے مشترک محاذ پر آج کی شکستِ فاش سے رہبرانِ کفر تلملا کے رہ گئے۔ فوراً ہی دارالندوہ میں مشاورت کی مجلس منعقد ہوئی اور طے پایا کہ ابھی محمد زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ اگر تعاقب کیا جائے تو آسانی سے انہیں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ہی لمحے کے بعد مکے کی گلیوں میں اعلان ہو رہا تھا کہ محمد کو جو بھی گرفتار کر کے لائے گا۔ اُسے انعام میں سُرخ اُونٹ دیئے جائیں گے۔

(۲)

عرب کے مانے ہوئے شہسوار سراقہ کے کان میں جونہی اس اعلان کی خبر پہنچی وہ انعام کے لالچ میں اس مہم کو سر کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ فوراً ہی ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوئے، باگ سنبھالی اور دم کے دم میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

کچھ دور چلنے کے بعد انھیں مدینے کے راستے پر دو جھلملاتے ہوئے سائے نظر

آئے۔ خوشی سے چہرہ دمک اٹھا۔ سرخ اونٹوں کی قطار تصور میں رینگنے لگی۔ فرطِ مسرت میں گھوڑے کو مہمیز لگائی اور ہوا سے باتیں کرتے ہوئے آن کی آن میں قریب پہنچ گئے۔

خدا کا آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ناقہ پر سوار مدینے کی طرف تیز تیز بڑھتا جا رہا تھا۔

سراقہ نے کمند ڈالنے کے لئے جونہی قدم آگے بڑھایا۔ ایک پر جلال آواز فضا میں گونجی

"یَا اَرْضُ خُذِیْہِ" ——— اے زمین اسے پکڑ لے۔

فرمان رسالت کو زمین کا حکم تھا۔ گیتی کا کلیجہ ہل گیا۔ فوراً زمین شق ہو گئی۔ اور سراقہ کے گھوڑے کا پاؤں گھٹنے تک دھنس گیا۔ سراقہ نے ہزار کوشش کی۔ لیکن زمین کی گرفت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ جب عاجز و مجبور ہو گئے تو دو عالم کے تاجدار سے رحم کی درخواست کی۔ سرکار نے ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور زمین سے خطاب فرمایا

"اُتْرُکِیْہِ" ——— اچھا اسے اب چھوڑ دے

ابھی یہ الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اچانک زمین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور گھوڑے کا پاؤں باہر نکل آیا۔

مال کی طمع بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ بنی نوعِ انسان کو دیدہ و دانستہ فریب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ رہائی پا کر جب سراقہ واپس لوٹ رہے تھے تو تقصیر کی ندامت کے احساس سے دل ڈوبا جا رہا تھا ——— جیسے ہی میل دو میل کی مسافت طے کی۔ لالچ کا شیطان پھر دل پر مسلط ہو گیا اور فریب کی راہ سے تلقین شروع کی کہ یہ واقعہ یونہی اتفاقاً پیش آگیا تھا۔ اس کے پیچھے محمد کی پیغمبرانہ توانائی کا قطعاً کوئی کرشمہ نہیں ہے۔

چلو واپس چلو ——— سرخ اونٹوں کے انعام کا زریں موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ محمد کی گرفتاری کوئی انہونی چیز نہیں ہے۔

دل کی آواز پر پھر سراقہ نے گھوڑے کی باگ موڑ دی۔ اور چند ہی لمحے میں سرکار کے قریب پہنچ گئے۔ اس بار لبِ مبارک کو جنبش ہوئی۔ سراقہ کی کوشش بے کار ہوئی اور وہ اپنے گھوڑے سمیت گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔

پھر سراقہ نے رحمتِ اکرم کو آواز دی۔ پھر بخشش و درگذر کو پکارا۔ اور پھر رحمت مجسم نے احسان کی بارشیں کی، زمین کو اشارہ کیا اور کائنات گیر اقتدار کی گرفت میں سسکتا ہوا دشمن پھر آزاد ہو گیا۔

اس بار دل کی گہرائی میں پیغمبر کی توانائی کا یقین پیدا ہو چلا تھا۔ بار بار سراقہ سوچ رہے تھے کہ ایک نیازمند کی طرح زمین کی یہ فرماں برداری بلا وجہ نہیں ہے۔ کائنات کے خدا کے ساتھ محمد کا کوئی معنوی تعلق ضرور ہے لیکن نفس کا شیطان بڑا ہی چابکدست اور سحر طراز دشمن ہے۔ یہ ظالم ایک ہی لمحے میں دل کی ساری بساط الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سراقہ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ شیطان نے پھر سرگوشی شروع کی:

"محمد اتنے ہی بڑے صاحب اقتدار ہوتے تو ایک تھکے ہوئے مجبور کی طرح مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت نہ کرتے۔ خیالی ہیبت کے آگے ہتھیار ڈال دینا بہادروں کا شیوہ نہیں ہے ——— سرخ اونٹوں کا انعام تمہاری زندگی کا نقشہ بدل دے گا۔ چلو واپس لوٹو۔ اس سے زیادہ زرّیں لمحہ تمہیں پھر کبھی میسر نہیں آئے گا۔"

بالآخر سراقہ پھر شیطان کے فریب کا شکار ہو گئے۔ پھر تیزی کے ساتھ واپس لوٹے۔ پھر پیغمبر کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ پھر زمین کا دہانہ کھلا۔ اور سراقہ ایک گرفتار پنچھی کی طرح سسکنے لگے۔

رحمت یزدانی نے دو بار سراقہ کو موقع دیا تھا کہ وہ سنبھل جائیں۔ لیکن جب بار بار کی تنبیہ کے بعد بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں تو پیغمبر نے خود حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھایا۔ اور دلنواز تبسم کے ساتھ سراقہ کو مخاطب کیا:

"سرخ اونٹوں کے فریب میں اپنے نوشتۂ تقدیر سے کیوں جنگ کر رہے ہو۔ تمہارا مستقبل میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ جس کی زلفوں کا اسیر بن کر جینا مقدر ہے۔ اسی کو گرفتار کرنے آئے ہو؟ کیا اب بھی تمہیں کفر کی شبِ دیجور کا سویرا نظر نہیں آرہا ہے۔ میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ کسریٰ کے سونے کے کنگن تمہاری کلائیوں میں چمک رہے ہیں۔ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے کہ نصیبے کی ارجمندی تمہیں ایک وارفتہ حال دیوانے کی طرح میرے سامنے لاکھڑا کرے گی۔ اور تمہارا سینہ

سلام و ایمان کی دولتِ لازوال کا گنجینہ بن جائے گا۔"

پیغمبرِ صادق کی زبانِ حق ترجمان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ سراقہ کے دل میں ترازو ہوگئے۔ تاریخ میں عالمی تسخیر کی یہ پہلی خوشخبری تھی جس کے پیچھے کوئی مادی سامان نہیں تھا حیرت ہے کہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ جیسے جابر و عظیم فرماں روا کے کنگن دیکھنے والا آج وطن سے بھی شہر بدر کر دیا گیا تھا۔

(۲)

حضرت سراقہ پر جلد ہی صبحِ سعادت طلوع ہوئی اور وہ مدینے کے دارِ امان میں پہنچ گئے۔ اور پروانے کی طرح شمعِ رسالت کے جلوؤں میں نہلاتے رہے۔ کلائیوں میں کسریٰ کے سونے کے کنگن پہننے کا یقین ان کے دل کی دھڑکنوں سے منسلک ہوگیا تھا۔ جس رسول نے جبریل و میکائیل، عرش و کرسی، لوح و قلم، جنت و دوزخ اور حشر و نشر کی خبر دی تھی، اسی رسول نے کنگن پہننے کی خوشخبری بھی عطا کی تھی۔ زندگی کے دن اسی انتظار میں گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ خلافتِ فاروقی کے عہدِ زریں میں حضرت سراقہ سخت بیمار پڑ گئے۔ حالت سنگین ہوگئی۔ صورتِ حال شہادت دے رہی تھی کہ اب چند سانسوں کے مہمان رہ گئے ہیں۔ اکابر صحابہ بالیں کے قریب جمع ہوگئے۔ عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہونے والوں کے نام کچھ لوگ اپنا پیام و سلام کہنا ہی چاہتے تھے کہ حضرت سراقہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور مسکراتے ہوئے کہا:

"آپ حضرات اطمینان رکھیں، یہ میرا آخری وقت نہیں ہے۔ اس وقت تک موت میرے قریب نہیں آئے گی جب تک کہ میں اپنے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن نہ پہن لوں۔ یہ چیز اپنی جگہ سے ٹل سکتی ہے لیکن سرکارِ رسالت کا فرمان نہیں ٹل سکتا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت سراقہ موت کے چنگل سے نکل آئے اور دیکھتے دیکھتے کچھ دنوں میں بالکل صحت یاب ہوگئے۔

(۳)

آج مدینے میں ہر طرف مسرتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سجدۂ شکر کے خاطر سب کی پیشانیاں بوجھل ہوگئی تھیں۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی لشکرِ اسلامی کی فتحِ ایران کی خوشخبری میسر آ رہی تھی۔ خدا کے غلاموں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو اپنے قدموں سے روند ڈالا تھا۔ آج تاریخ میں پہلی بار کسریٰ کے ایوانوں پر عظمتِ اسلامی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ حق کی سطوت و جبروت کے آگے باطل

اقتدار کا غرور چکنا چور ہوگیا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد ایران سے اموال غنیمت سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار مدینے میں پہنچی۔ کسریٰ کے محل کا ساز و سامان دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ مسجد نبوی کے فرش پر سارا مال غنیمت بکھیر دیا گیا۔

امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے کسریٰ کے کنگن دریافت کئے۔ تلاش کے بعد جب وہ مل گئے تو حضرت سراقہ کو آواز دی گئی۔ اس وقت حضرت سراقہ کا عالم قابل دید تھا۔ ناز سے جھومتے ہوئے تھے فرط مسرت سے چہرہ دمک رہا تھا۔ ارمانوں کے ہجوم میں مچلتے ہوئے اٹھے اور فاروق اعظم کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

آج حضرت سراقہ کے لئے زندگی کی محبوب ترین گھڑی آگئی تھی۔ جس آرزو کو ساری عمر ایمان کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا وہ آنکھوں کے سامنے جلوہ گر تھی۔ اہل مدینہ بھی کیف و مستی کے عالم میں اپنے آقا کا زندہ معجزہ دیکھ رہے تھے۔ امنڈتے ہوئے خوشی کے آنسوؤں میں حضرت فاروق اعظم نے حضرت سراقہ کی کلائیوں میں کسریٰ کے کنگن پہنائے۔ سر پہ تاج رکھا اور شاہی قبا زیب تن کرائی۔ حضرت سراقہ کی شاہانہ سج دھج دیکھ کر اہل مدینہ جذبات سے بے قابو ہو گئے۔ فرط شوق میں منہ سے چیخ نکل گئی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی عشق و ایمان کی رقت انگیز کیفیت سے بے خود ہو گئے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> اس وقت کی بات ہے جب اسلام بے سرو سامانی کے عالم میں تھا۔ ایک یزدانی مسافر نے آج کی عظیم الشان فتح کی خبر دی تھی ——— کل میدان قیامت میں آپ حضرات گواہ رہئے گا کہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنا کر میں نے اپنے آقا کا فرمان پورا کر دیا۔"

سرکار رسالت کی شوکت اقتدار کا یہ منظر تاریخ فراموش نہیں کرے گی کہ ایک جنبش لب پہ کائنات گیتی کا نقشہ بدل گیا۔ اور عشق رسالت کے فیضان نے عرب کے صحرا نشینوں کو چشم زدن میں ساری دنیا کا فرماں روا بنا دیا۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

علامہ ارشد القادری

کوچۂ جاناں

عشق کی سرفرازی کا ایک انتہائی رقت انگیز واقعہ

عبداللہ عراق کا مشہور ڈاکو، سفاک، خونخوار، غارت گر اور ستم پیشہ تھا۔ آج ایک خوفناک مہم سے پلٹ کر اپنے گھر آیا تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی، ساتھیوں نے رخصت ہوتے وقت دریافت کیا:

"سردار! دوسری مہم کی تیاری کب تک ہوگی؟"

آج جانے کیا بات تھی کہ اس سوال پر عبداللہ کے چہرے سے خوشی کا کوئی نشان نہیں ظاہر ہوا۔ اس نے نہایت بے دلی سے جواب دیا:

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، تیاریوں کی اطلاع تمہیں وقت سے پہلے دی جائے گی"

ساتھیوں کو رخصت کر کے جب وہ اپنے بستر پہ لیٹا تو ایک نامعلوم کسک سے اس کا دل بوجھل تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ وہ خوف کے عالم میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ غفلتوں کی نیند بہت گہری تھی۔ پھر مطمئن ہو کر پھر لیٹ گیا۔ لیکن اس مرتبہ دل کا بند دروازہ باز ہو چکا تھا اور تائید غیبی کی کرنوں کے لیے گنجائش نکل آئی تھی۔

اچانک دل کے دروازے سے کوئی دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا:

"غافل! ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھ! تیرے دامنِ زندگی کا ایک ایک ورق سیاہ ہو چکا ہے۔ مظلوموں کی آہ، بے گناہوں کے خون اور معاصی کے بوجھ تیری گردن اب توڑنا ہی چاہتی ہے۔ مرنے کے بعد جب تو ایک باغی مجرم کی طرح خدائے قہار کے

سامنے کھڑا کیا جائے گا تو دہشت وجلال سے تیرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ انجام کی رسوائی اور جہنم کے ہولناک عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو اب بھی وقت ہے۔ اُٹھ! اور اپنے خاکی جسم سے شیطان کا یہ پیراہن اُتار کر پھینک دے۔ مغفرت وکرم کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے جیسے بھی ممکن اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو راضی کر لے۔"

ہاتفِ غیب کی یہ خاموش صدا نہایت تیز نشتر کی طرح عبداللہ کے جگر سے پار ہو گئی اور اسے تڑپتے ہوئے بسمل کی طرح گھائل کر گئی۔

اب دل کی اندرونی حس بیدار ہو چکی تھی اور عمر بھر کی کثافتوں کا غبار آنکھوں کی راہ سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا۔

اسی عالمِ اضطراب اپنے بستر سے اُٹھا اور رات کی تاریکی میں اپنے سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی جعفر کے گھر گیا۔ عبداللہ کی بے وقت آمد سے جعفر گھبرا اُٹھا۔ اس نے جلدی میں پوچھا:

"کیا کسی فوری مہم کی تیاری ہے؟"

عبداللہ نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا "ہاں! آج زندگی کی سب سے بڑی مہم ہے میرے دوست" اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آج پہلی مرتبہ عبداللہ کو روتا ہوا دیکھ کر جعفر حیران ہو گیا۔

حیرت سے دریافت کیا "یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے سردار؟"

ہچکیاں بھرتے ہوئے عبداللہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

"جعفر! اس وقت میں ہولناک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوا ہوں۔ اپنی سیہ کار زندگی اور اس کے بھیانک انجام کے تصور سے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ خدا را بتا کہ ایک باغی مجرم کی طرح عمر کا جو حصہ میں نے گزارا ہے کیا اب کسی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی ایسی شکل ہے کہ میں اپنے روٹھے ہوئے پروردگار کو راضی کر لوں؟ کیا اس رحمتِ خاص کا کہیں سراغ لگ سکتا ہے جس کے تئیں نامۂ عمل کی سیاہی دھونے کے لئے دیدۂ شرمسار کا قطرہ ایک

قطرہ کافی ہے۔

جعفر! میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں۔ مجھے چراغ دکھاؤ! میں اپنے رب کی طرف پہنچنا چاہتا ہوں۔ میری رہنمائی کرو۔ میں گھائل ہو گیا ہوں۔ میرے زخموں کی ٹیس کے لئے کوئی مرہم بتاؤ۔"

اتنا کہتے کہتے عبداللہ کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ چُپ ہو گیا۔

ایک غمگسار چارہ گر کی زبان میں جعفر نے جواب دیا:——

"دل کا یہ رقت انگیز انقلاب درسوز وکرب کی یہ نئی منزل تمہیں مُبارک ہو ہمدرد! افسوس! کہ تمہاری ہی طرح میں بھی اس کوچے سے ناآشنا ہوں اس لئے یاد رکھو کہ دل کے ہزار جذبۂ خلوص کے باوجود میں تمہاری کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔

البتہ اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ خدا کی تلاش میں نکلنے والے سب سے پہلے کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اُسے پالینے کے بعد خدایابی کی منزل بہت قریب ہو جاتی ہے۔ سُنتے ہیں خدا تک باریابی کے لئے یہی ایک راہ اب تک کُھلی ہوئی ہے۔ باقی تمام راستے بند ہیں۔ خُدا کی طرف قدم بڑھانا چاہتے ہو تو تمہارے لئے بھی اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ کسی مرشدِ کامل کا دامن تلاش کرو——

میں نے سُنا ہے کہ مرشدِ کامل ہی اس راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہوتا ہے۔ مرشدِ کامل کے بغیر یہ راہ آج تک کسی نے بھی طے نہیں کی ہے عبداللہ!"

جعفر کی اس بات پر عبداللہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کا سوکھا ہوا چہرہ اس طرح کھل گیا جیسے یاس کی تاریکیوں میں اُسے اُمید کی کوئی کرن نظر آگئی ہو۔ ایک ممنون شکرگزار کی زبان میں اُس نے جعفر کی ہمدردیوں کے جواب میں کہا:——

"میرے دیرینہ ہمدم! تمہاری غمگسار رہنمائی کا شکریہ! تم نے میرے رِستے ہوئے زخموں پر جیسے تسکین کا مرہم رکھ دیا۔ اب اگرچہ میں مایوس نہیں ہوں لیکن میرے دوست! کسی مرشدِ کامل کی تلاش کا صحیح شعور بھی تو مشکل امر ہے۔ اس مشکل کو بھی اب تم ہی آسان کرو۔ تم ہی کسی مرشدِ کامل کا نشان بتاؤ۔ میں اس کی گلی

جھک گئیں۔ دل ایک نامعلوم ہیبت سے مرعوب ہو گیا۔

نورانی بزرگ نے پُرشکوہ لہجے میں دریافت کیا ـــــ "تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

آنکھیں نیچی کئے ہوئے عبداللہ نے جواب دیا ـــــ "مرشدِ کامل کے انتظار میں۔"

نورانی بزرگ نے پھر سوال کیا ـــــ "کون مرشدِ کامل؟"

عبداللہ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا ـــــ "وہی مرشدِ کامل جس کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا ہوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم یہیں میرا انتظار کرو۔ میں واپس ہونے کے بعد تمہیں بارگاہِ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچا دوں گا۔"

نورانی بزرگ نے قہر آلود انداز میں ارشاد فرمایا ـــــ "میرے عزیز! وہ مرشدِ کامل نہیں ہے۔ اندھیری راتوں کا سیاح ہے۔ بارگاہِ یزدانی کا راستہ اسے خود نہیں معلوم۔ وہ تمہاری کیا رہنمائی کرے گا۔ اب وہ پلٹ کر نہیں آئے گا۔ بلا وجہ اس کے انتظار میں اپنی جوانی ضائع نہ کرو۔"

عبداللہ نے اصرار کرتے ہوئے جواب دیا ـــــ "میرے دل کا یقین کسی طرح منحرف نہیں ہو سکتا کہ وہ ضرور واپس آئے گا اور اسے بارگاہِ یزدانی کا راستہ قطعاً معلوم ہے۔ مرشدِ کامل کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

نورانی بزرگ نے تنبیہہ کے لہجے میں فرمایا ـــــ "ایک غلط بات پر اصرار مت کرو۔ تم شیطان کے فریب میں مبتلا ہو۔ اپنی نادانی سے باز آؤ۔ جسے تم نے مرشدِ کامل سمجھ لیا ہے، سوتے ہوئے انسانوں کی آنکھوں سے نیند چرانے والا ہو تو مرشدِ کامل ہو سکتا ہے [illegible] تمہیں حقیقت کی خبر نہیں ہے ـــــ [illegible] تمہارا [illegible]"

ابھی [illegible] عبداللہ [illegible] تھا۔ مرشد کے [illegible] ضرور [illegible] ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔ [illegible] کے بعد [illegible] کی آگ میں سلگتے ہوئے کہا ـــــ "مجھے [illegible] افسوس ہے کہ ایک طرف تو [illegible] دین پر [illegible] ٹوٹ رہا ہے اور دوسری طرف آپ مرشدِ کامل کی مذمت کر رہے [illegible]

اس کا اندازہ غلط نہیں تھا کہ یہ شہر کے کسی بڑے رئیس کا گھر ہے۔ پاس ہی گزرتے ہوئے ایک راہ گیر سے دریافت کیا: ——

"کیا یہ شہر کے کسی بڑے رئیس کا گھر ہے؟"

اس نے جواب دیا —— "صرف شہر ہی کا نہیں روئے زمین کے سب سے بڑے رئیس کا گھر ہے یہ، آج تک اس کے خزانے کی کوئی تھاہ نہیں پا سکا۔ اس کے قدموں کے نیچے سونے اور جواہرات کے کان بچھے رہتے ہیں۔ ہفت اقلیم کی بادشاہی اس کے گھر کی ایک ادنیٰ کنیز ہے۔ ہواؤں، دریاؤں، صحراؤں اور پہاڑوں پر ہر جگہ اس کی شوکت اقتدار کا پرچم سرگرم ہوتا ہے۔"

راہ گیر کی یہ باتیں سن کر اس کا دل ایک نامعلوم ہیبت سے مرعوب ہو گیا۔ فرط حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا ہو سکے: ——

"اس رئیس کا نام کیا ہے؟"

"ایک نام ہو تو کوئی بتائے بھی۔ بے شمار نام ہیں اس کے —— دستگیر کونین، شفیع الثقلین، خواجۂ کائنات، سلطان الاقطاب، مخدوم اولیاء، غوث اعظم، امام اعظم، ابن جیلانی، محبوب سبحانی، یہ اور اسی طرح کے ناموں کا ایک زریں سلسلہ اس کی ذات سے منسوب ہے" —— راہ گیر نے جلدی میں جواب دیا اور ایک لمحہ رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔

یحییٰ نے فاتحانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا "معلوم ہوتا ہے آج قسمت کا ستارہ چمک اٹھا ہے۔ اتنے بڑے دولت مند کے گھر پر ہاتھ صاف ہو گیا تو عمر بھر کے لئے کافی ہے"

تھوڑی دیر تک غور و فکر کے بعد ساری تدبیر مکمل ہو گئی۔ یحییٰ نے نہایت ہوشیاری سے سب کے فرائض تقسیم کر دیے۔

آج جانے کیا بات تھی کہ حضرت والا کی خانقاہ کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کافی بیت چکی تھی، سارا شہر نیند کی خموشی میں شرابور تھا۔ کہیں کہیں سے رات کے پاسبانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یحییٰ دبے پاؤں خانقاہ کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا۔ دروازہ

کھلا ہوا دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ ہمت کر کے اندر داخل ہوا۔

اندھیرے میں دیر تک اِدھر اُدھر ٹٹولتا رہا، لیکن کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔ سخت حیران تھا کہ اتنے بڑے رئیس کا گھر اور بالکل خالی۔ ناکامی کی حسرت کے ساتھ واپس ہوتے ہوتے سوچا کہ کیوں نہ اس گھر کا غبار ہی لیتے چلیں، ممکن ہے [illegible] رکھی چھپی ہو۔

چاروں طرف سے گرد و غبار جمع کر کے ایک چھوٹی سی گٹھری بنائی اور سر پر رکھ کر جونہی دروازے سے باہر قدم نکالا کہ اچانک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دو چار بار پلک جھپکانے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے۔ گھبرا کر بیٹھ گیا۔ دل ڈوبتا رہا۔ آگے بڑھنے کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اتنے میں قریب ہی سے پاسبانوں کی آواز کان میں آئی۔ گھبرا کر پھر گھر کے اندر پلٹ آیا اور ایک کونے کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا۔

کونین کا دستگیر اور ثقلین کا غوث تہجد کی نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ عارضِ تاباں سے نور کی کرن پھوٹ رہی تھی۔ پیشانی کی موجوں میں کرن لہرا رہا تھا۔ آنکھوں سے تجلیات کے چشمے اُبل رہے تھے اور دل کی شمعِ فروزاں اقلیمِ ولایت کے نگار خانوں کو چمکا رہی تھی۔

سامنے رجال الغیب ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ایک نقیب نے آگے بڑھ کر عرض کیا:

"عالم پناہ! فلاں شہر کے ابدال کا انتقال ہو گیا ہے۔"

زبانِ حق ترجمان سے مغفرت و رحمت کی دعا دیتے ہوئے سرکارِ غوثیت اور آگے بڑھ گئے۔

اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر چونک اٹھے۔ جانے کا ارادہ ملتوی کر رہا تھا کہ کچھ سوچ کر وہیں بیٹھ گئے۔

"آج میرے گھر کون مہمان ہے؟"

کشورِ دل کو فتح کر لینے والی ایک آواز کان میں آئی۔ اُمید و بیم کی کشمکش میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایک اقبالی مجرم کی طرح بمشکل تمام یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔

ہے۔ مسیحی قوموں کی ساری طاقتیں چاروں طرف سے سمٹتی آرہی ہیں۔ مگر اسلام کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے شہنشاہ ہرقل کے سارے سورما سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔

پچاس ہزار ٹڈی دل مجاہدین پر مشتمل اسلامی لشکر اسی پہاڑ کے عقب میں ٹھہرا ہوا ہے۔ آج ہی رات کو پچھلے پہر روم کی سرحد کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

عربی سواروں کی زبان سے یہ خبر سن کر تینوں بھائی فرطِ شوق میں جھوم اٹھے۔ کوثر کی شراب کا نشہ آنکھوں میں اتر آیا اور شہادت کا زندہ احساس انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔

سرداروں کی رہنمائی میں تینوں تیز قدم اٹھاتے ہوئے جونہی وہ اسلامی لشکر کے قریب پہنچے، جوش عقیدت سے نعرۂ تکبیر کی آواز بلند کی۔ لشکر میں بھی لوگوں نے جواب پرجوش نعرے سے دیا۔

تینوں نئے مجاہدین کی آمد پر سارے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے قدموں کے نیچے اپنے دلوں کا فرش بچھا دیا۔ سپہ سالار نے انہیں سینے سے لگایا، دعائیں دیں اور ان کے ولولوں کی تپش معلوم کر کے مبارکباد پیش کی۔

رات کے پچھلے پہر تہجد کی نماز سے فارغ ہوتے ہی کوچ کا اعلان ہوا اور دم کے دم میں کہسار کی وادیاں خالی ہو گئیں۔

دریاؤں، پہاڑوں اور صحراؤں کو عبور کرتا ہوا اسلامی لشکر بڑی سرعت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہیبت جلال سے دھرتی کا سینہ دہلنے لگا — کائنات کی سب سے بڑی طاقت آج حرکت میں آگئی تھی۔ اسلام کی غیرت نے ایک ایسی انگڑائی لی تھی کہ بڑے بڑے سورماؤں کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔

شب و روز چلتے چلتے روم کی سرحد کا فاصلہ جب چند میل رہ گیا تو رات کو دم لینے کے لئے سپہ سالار لشکر نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ دشمن کی نقل و حرکت کا سراغ لگانے اور جنگی خبریں حاصل کرنے کے لئے پچاس مجاہدین پر مشتمل جو دستہ تیار کیا گیا اس میں تینوں بھائی بھی شامل تھے کیونکہ انہیں سب سے زیادہ روم کے متعلق پوری واقفیت حاصل تھی۔

یہ دستہ پہاڑوں اور جنگلوں کے محفوظ مقامات سے گذرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا

آنکھ کھلی تو منزلِ قدس کا مسافر عشق کے سمندر میں غوطہ لگا چکا تھا۔ فرشتے اس کی مقدس روح کو نور کے جھرمٹ میں لئے عالمِ بالا کی طرف جا رہے تھے ـــ کملائے ہوئے پھول کی طرح جلی ہوئی نعش تیل کی سطح پر تیر رہی تھی ـــ لیکن روحِ شاداں و فرحاں ساقیٔ کوثر کے حضور میں خلعتِ شاہانہ سے سرفراز ہو چکی تھی۔

اب منجھلے بھائی کی باری تھی۔ رسی کا پھندا گلے میں ڈالتے ہوئے جلادوں نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا ـــ تنہائی، غریب الوطنی اور بے کسی سوکھے ہوئے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ شدتِ کرب سے پلکیں بھیگی ہوئی تھیں ـــ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے منجھلے بھائی کو بھی الوداع کہا ـــ اسی طرح کا دردناک منظر اس بار بھی نگاہوں کے سامنے تھا۔ جب تک دیکھ سکا، دیکھتا رہا۔ نہ دیکھا جا سکا تو آنکھیں بند کر لیں ـــ پھر کلمۂ شہادت کی آواز گونجی، پھر یا محمدؐ کا نعرہ بلند ہوا۔

اور چند ہی لمحوں کے بعد مدتوں کی تشنہ روح ساقیٔ کوثر کے حضور جامِ رحمت سے سیراب ہو چکی تھی۔

پندرہ برس کا ایک نوجوان مجاہد۔ حُسن کا پیکر، جمیل، روشن پیشانی، سرمگیں آنکھیں، دمکتا چہرہ۔ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔

یہ سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ ننھی عمر میں دو بھائیوں کی تڑپتی لاشیں نظر سے گذری تھیں۔ دل غم سے نڈھال اور شکستہ حال ہو چکا تھا۔ لیکن دین کی غیرت اسی طرح تازہ دم تھی۔ اسلام کے جذبۂ دل پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ جب اس عالم ہی سے منہ پھیر لیا تھا تو اب زندگی کا ڈر کیسا؟ قاتل نے بڑھ کر گلے میں پھندا ڈال دیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ دل خیالِ جاناں میں ڈوب گیا۔ اوپر اٹھانے کے لئے رسی کھینچنا ہی چاہتا تھا۔ مملکت کے وزیر نے ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت لجاجت کے ساتھ بادشاہ سے درخواست کی ـــ

"جہاں پناہ! یہ کمسن نوجوان تنہا رہ گیا ہے۔ یہ پکا نہیں معلوم ہوتا۔ نہایت بھولا بھالا ہے۔ آسانی کے ساتھ اسے مذہبِ اسلام سے منحرف کیا جا سکتا ہے۔ آپ اسے میرے حوالہ کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ چند ہی دنوں کے اندر اسے عیسائی مذہب

قبول کرنے کے لئے تیار کر لوں گا۔

بادشاہ نے اپنے وزیر کی درخواست منظور کر لی۔ اشارہ کرتے ہی جلادوں نے نوجوان کے گلے سے پھندا اتار دیا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ منزل قدس کے مسافر کو آدھے راستے سے لوٹ آنا پڑا۔

مقتل سے اٹھ کر وزیر نے اپنے محل کا رخ کیا۔ نوجوان بھی ہمراہ تھا اور زندگی سے گریزاں، کسی دوسری ارجمند موت کی راہ سوچ رہا تھا۔

وزیر نے محل میں داخل ہوتے ہی حرم سرا کو آواز دی —— ”دیکھو! اس نوجوان کو سب سے زیادہ آراستہ و مکلف کمرے میں ٹھہراؤ۔ زندگی کی ساری آسائشیں اس کے قریب جمع کر دو۔

تھوڑی دیر کے بعد کنیزوں کے جھرمٹ میں شہزادی ثوارت بڑے ناز سے اپنے باپ کے پاس حاضر ہوئی۔ وزیر نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔ سر پر ہاتھ پھیر کر پہلو میں بٹھایا!

”میری ذہین اور سعادت مند بیٹی! آج میں نے ایک نہایت سنگین اقدام کر لیا ہے تمہاری ذہانت سے توقع ہے کہ میری زبان کا بھرم ضائع نہیں ہوگا۔“

شہزادی نے گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا —— ”بندگان عالی کا حکم سر آنکھوں پر کنیز جان دے کر بھی اپنا فرض ادا کرے گی۔ لیکن حکم کی صورت حال سے باخبر کیا جائے!“

وزیر نے کہا —— ”وہ تین جنگی قیدی جو عرب کی سرحد سے گرفتار ہو کر آئے تھے، وہ تینوں بھائی تھے ان میں سے دو آج موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ سب سے چھوٹا بھائی جو ایک نہایت خوبصورت اور بڑا ہی شکیل و دلکش نوجوان ہے اسے میں نے تختۂ دار سے یہ کہکر اتار لیا ہے کہ میں چالیس دن کے اندر اسے اپنا مذہب تبدیل کرنے پر راضی کر لوں گا۔ بادشاہ نے میری درخواست کو شرف قبول عطا کیا ہے۔ میں اس نوجوان کو اپنے ہمراہ لے کر آیا ہوں۔ اگر میں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا تو سارے روم پر میرے حسن تدبیر کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ متاثر ہو کر وزارت عظمیٰ کا منصب میرے حوالہ کر دے؟

سے، یہیں نکل چلیں، ورنہ میرا اسلام ظاہر ہو جانے کے بعد ہم دونوں کی جان لئے بغیر یہ ظالم دم نہیں لیں گے۔

نوجوان نے اس شرط پر چلنا منظور کر لیا کہ تمہیں اپنے پورے جسم کے ساتھ نقاب کے اندر رہنا ہوگا۔ اور میرے آگے نہیں پیچھے چلنا ہوگا۔

دوسرے دن جبکہ رات ڈھل چکی تھی۔ سارا محل نیند کی آغوش میں تھا۔ دو تیز رفتار گھوڑے محل کے عقبی دروازے پر کھڑے تھے۔ تاریکی میں دو سائے بڑھتے ہوئے نظر آئے چند ہی لمحوں کے بعد ہلکی ہلکی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ آبادی سے باہر نکل کر یہ آواز اور تیز ہو گئی۔ ہوا سے باتیں کرتے ہوئے گھوڑے سرپٹ دوڑتے جا رہے تھے۔ آگے آگے نوجوان اور پیچھے چند قدم کے فاصلے پر شہزادی چل رہی تھی ۔ ابھی رات بہت باقی تھی شہر سے کافی دور نکل آنے کے بعد گھوڑوں کی رفتار دھیمی کر دی گئی۔ آہستہ آہستہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ راستے سے یہ سوار گزر رہے تھے۔ جونہی دہانے کے قریب پہنچے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کان میں آئی۔ دونوں چوکنے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ تلواریں نیام سے باہر کر لی گئیں۔ شہزادی نے کہا — "معلوم ہوتا ہے دشمن ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں"

نوجوان نے تسلی دیتے ہوئے کہا :—

"کچھ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آنے والے اگر بری نیت سے آ رہے ہیں تو ہماری تلوار ان کی راہ میں حائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ اور اگر وہ صرف راہگیر ہیں تو ہم ان سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔"

دو پہاڑوں کے دہانے سے باہر نکلنے کے بعد نوجوان ایک عجیب و غریب تماشہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بیساختگی میں منہ سے چیخ نکل گئی :—

"بھائی جان! کئی مہینے گزر گئے آپ حضرات کو جام شہادت نوش کئے۔ آپ یہاں کیسے؟ عالم برزخ میں رہنے والے کیا زندوں کی طرح دنیا میں آ سکتے ہیں؟"

بڑے بھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "شہیدوں کا حال عام مُردوں

سے بالکل مختلف ہے۔ وہ جہاں اور جیسے برزخ میں جانا چاہیں جا سکتے ہیں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مرحوم بھائی نے یہ خوشخبری سنائی کہ ملاءِ اعلیٰ میں تمہاری طہارت و پاکدامنی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تمہارا عقد اِس نوعمر شہزادی سے کریں۔ شہیدوں کی یہ پاک و عفیف روحیں تمہاری بزمِ نکاح میں شرکت کے لئے حاضر ہوئی ہیں۔"

شہزادی وہیں کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ عالمِ غیب سے آنے والوں کا یہ قافلہ دیکھ کر اُسے اسلام کے کائنات گیر اقتدار کا یقین اور بڑھ گیا —— جلدی جلدی بزمِ نکاح منعقد ہوئی۔ ارواحِ طیبات کی موجودگی میں ایجاب وقبول کی رسم ادا کی گئی۔ خطبۂ نکاح کے بعد تمام روحوں نے نئے جوڑے کو مبارکباد کی دعائیں دیں۔ بھائیوں نے دُولہا اور دُلہن پر جنت کے پھول نچھاور کئے۔

روحانیوں کا یہ سارا مجمع دم بھر کے دم میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا

اب محرم آنکھوں پر شہزادی نے چاندنی رات میں اپنے چہرے کا نقاب اُلٹ دیا۔ پہلی بار نوجوان کی نظر پڑی تو ایسا محسوس ہوا کہ جنت سے حسن و لطافت کی کوئی حور اُتر آئی ہے۔

"دل دیوانہ"، وہ حیرتوں کے نشانے سے ابھی ہٹا نہیں تھا کہ فضاؤں میں یہ آواز گونجی جنت کی برات، جنت کا دولہا، جنت کی حور مبارک ہو!

ارشد القادری
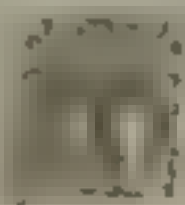
گیا۔ نبیں موسنے والے مقدمات کی سماعت کا سب ختم ہو چکنے کے بعد خطیب شاہی فقیر کی طرف متوجہ ہوا۔ ———

" تمہاری کیا فریاد ہے۔؟ "

فقیر نے جواب دیا: ———

" ایک ایسی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں جسے مجمعِ عام میں نہیں پیش کرسکتا۔ تنہائی کا موقع عنایت فرمایا جائے۔"

دربار ختم ہونے کے بعد فقیر طلب کیا گیا۔ وزیر نے دریافت کیا " جہاں پناہ کے حضور میں تمہیں کیا کہنا ہے۔؟"

" جہاں پناہ کی شہزادی کے ساتھ نکاح کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں " فقیر نے نہایت جرأت سے جواب دیا ———

ابھی فقیر کی زبان کا یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ فرطِ غضب میں وزیر کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ بھرپور برہمی کے انداز میں کانپتے ہوئے کہا:

" حرمِ شاہی کے ساتھ ایک فقیر کی نہایت توہین آمیز جسارت ہے یہ لب کشائی کی جرأت۔ پہلے تمہیں اپنی حیثیت کا اندازہ لگانا چاہیئے تھا۔ اس ناقابلِ برداشت گستاخی کی تمہیں سزا ملنی چاہیئے۔ تاکہ آئندہ خاندانِ شاہی کی حرمتوں سے کھیلنے کی کسی کو جرأت نہ ہو۔"

سلطان نے وزیر کو خاموش کرتے ہوئے کہا: ———

" یہ مجرم نہیں ہے۔ اسلام کا بخشا ہوا حق استعمال کر رہا ہے۔ پیغامِ نکاح کے لئے اسلام میں شاہ و گدا، امیر و غریب، چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس کی درخواست کا جواب تازیانوں کی دھمکی سے نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنا جواب حاصل کرنے کے لئے ایک ہفتہ بعد آئے۔"

— یہ جواب سن کر پیشانی میں امید کی تابانی لئے ہوئے فقیر دربارِ شاہی سے واپس لوٹا۔

دلِ بیتاب کے لئے ایک ہفتہ کی مدت صبحِ قیامت کی طرح طویل ہو گئی۔ بڑی مشکل سے انتظار کے یہ دن کٹے۔

اس درمیان میں بادشاہ نے وزیر کو اپنی منشا سے آگاہ کر دیا تھا کہ صاف انکار کے بجائے حسنِ تدبیر سے فقیر کو ٹال دینا چاہئے۔ یا پھر کوئی ایسی کڑی شرط رکھ دی جائے جس کا پورا کرنا قریب ناممکن ہو۔

جب ساتویں دن فقیر دربار میں حاضر ہوا تو وزیر نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اعزاز کے ساتھ بٹھایا اور مہر و شرافت کی زبان میں فقیر سے مخاطب ہوا: ——

"شہزادی کے لئے دنیا کے دور دور تک بادشاہوں کی طرف سے بے شمار پیغامات موصول ہوئے ہیں۔ تمہارا پیغام بھی انھیں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جبکہ تم اگر ایک شرط پوری کر دو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا پیغام قبول کر لیا جائے گا۔"

وزیر کی یہ بات سن کر فقیر کے دل میں امید کی ایک کرن پھوٹی۔ اور فرطِ شوق میں فقیر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ خودی کی حالت میں بول پڑا: ——

"فرمائیے! میرے حق میں یہ خدمت ہے۔ اس شرط پوری کرنے کے لئے متاعِ زندگی تک داؤ پر لگا دوں گا۔"

وزیر نے کہا: ——

"شہزادی کی خوشی کے لئے سیاہ رنگ کا ہیرا چاہیئے۔ اس سے زیادہ اور کوئی شرط نہیں۔"

فقیر نے جواب دیا: ——

"اس شرط کی تکمیل اگرچہ ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اسے پورا کر دوں گا۔ سنا ہے کہ وہ ہیرا سیاہ رنگ کے پہاڑوں کی برفیلی چوٹی میں پیدا ہوتا ہے —— خدا میری مدد کرے گا۔"

رات بھیگ چکی تھی۔ سارا شہر سناٹے کے عالم میں محوِ خواب تھا۔ فقیر کی کٹیا سے

کبھی کبھی سسکیوں کی آواز سنائی پڑتی تھی۔ پیشانی زمین پر رکھے شکستہ آنکھوں سے ساتھ وہ کہہ رہا تھا:——

"اے دردمندوں کے چارہ ساز! سسکتا ہوا دل لے کر تیرے در پر حاضر ہوا ہوں۔ حسرتوں کی بجلی گری ہوئی راکھ کو زندہ کر دے۔ اے مجبور بندوں کی آخری امیدگاہ! مشکلات کے اندھیرے میں قدم اٹھا رہا ہوں اپنی رحمتوں کے سہارے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ اپنے حبیب کی شاداب تجلیوں کے صدقے میں میرے رستے ہوئے زخموں اور بھیگی ہوئی پلکوں پر رحم فرما۔"

صبح ہوتے ہوتے اس کے آنسوؤں کا طوفان تھم گیا سجدے سے سر اٹھایا تو پیشانی کے افق پر یقین کا اُجالا چمک رہا تھا۔ شاید رحمتِ بندہ نواز کی کوئی غیر محسوس تجلی دل کے ویرانے میں اُتر آئی تھی۔ ایک ٹوٹ عزم کا تیور لئے ہوئے فقیر اٹھا اور کاندھے پر تیشہ رکھ کر آبادیوں سے باہر نکل آیا۔ عالمِ وحشت میں شبانہ روز چلتا رہا۔ اسے اپنی منزل خود نہیں معلوم تھی کہ دل کے غیبی سگنل پر قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ خدا کی اس وسیع کائنات سے صرف سیاہ رنگ کے ہیرے کا ایک چمکتا ہوا نگینہ مطلوب تھا۔

چلتے چلتے ایک دن کہساری وادیوں میں شام ہو گئی۔ ہر طرف وحشت ناک تاریکی اور بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی سربلند پہاڑوں کی دیواریں راستہ روکے کھڑی تھیں۔ حیرانی کے عالم میں ایک پتھر کی چٹان پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خوفناک درندوں کی آوازیں ہر طرف سے گونجنے لگیں۔ زندگی خطروں میں گھر گئی جان کے لالے پڑ گئے لیکن خدا کی کارسازی پر اس کے دل کا مخفی اعتماد پہاڑ کی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ کرشمۂ غیب کے ایک تماشائی کی طرح وہ ساری رات جاگتا رہا۔ صبح کے وقت جونہی آنکھ لگی کسی نے شانہ پکڑ کر ہلا دیا۔ آنکھ کھل گئی —— ایک بوڑھا آدمی سامنے کھڑا کہہ رہا تھا:——

"جس راستے سے تم یہاں تک پہونچے ہو اس کے دہانے پر کالے پہاڑ کی بلندی سے ایک بہت بڑی چٹان ٹوٹ کے گری ہے۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے تیشہ اٹھاؤ اور کاٹ کر اپنے نکلنے کا راستہ بناؤ ورنہ آج شام تک یہ ساری

وادی برف کے سیلاب سے ڈوب جائے گی۔“

فقیر گھبرا کے اٹھا جیسے ہی وادی کے دہانے پر پہنچا دیکھا کہ برف کی بہت بڑی چٹان راستے میں حائل ہو گئی ہے۔

سارا دن تیشہ چلتا رہا۔ دن بھر کی لگاتار محنت کے باوجود گزرنے کے لائق راستہ نہیں بن سکا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ فقیر نے پوری طاقت کے ساتھ تیشہ چلایا۔ بھرپور وار سے چٹان کا بہت بڑا حصہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ جمی ہوئی چٹان کے اندر سیاہ رنگ کا ایک تابدار نگینہ چمک رہا تھا۔ فقیر نے حیرت کے ساتھ اسے کھود کر نکالا۔ ہتھیلی پر رکھتے ہی ایک کرن پھوٹی اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

پردۂ غیب کی کارسازی پر فقیر کا دل جھوم اٹھا۔ نامعلوم طور پر اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ سیاہ رنگ کا ہیرا ہے جسے گوہر مقصود کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔

ایک حیرت انگیز خوشی کے عالم میں وہ شہر کی طرف جست لگاتا ہوا چل پڑا۔ کئی دن کے مسلسل روز سفر کے بعد شام کو وہ شہر پہنچ گیا۔ دوسرے روز شاہی دربار میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا۔

وزیر نے دیکھتے ہی ایک برہمی کے انداز میں کہا:——

”تم پھر آ گئے۔ حالانکہ اس دن تم سے آخری بات کہہ دی گئی تھی۔ شریف لوگوں کا یہ شیوہ نہیں تھا۔“

فقیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:——

”برہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شرط پوری کرنے آیا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے سیاہ رنگ کا چمکدار ہیرا بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی بار دنیا کا یہ بے مثل ہیرا دیکھ کر سارے درباری دنگ رہ گئے۔ بادشاہ بھی مجسم تصویر حیرت بنا دیکھتا رہا۔

وعدہ کے مطابق فقیر نے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ اسے کامل یقین تھا کہ شاہد مقصود سے ہمکنار ہونے کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ لیکن وائے رے ناکامی قسمت! کہ پھر وزیر

نے ایک پانسہ پھینکا اور آخری فیصلہ سنانے کے لئے دوسرے دن دربار میں طلب کیا گیا۔
ارمان اور آرزو کی ایک دنیا بھرے ہوئے فقیر دوسرے دن دربار میں حاضر ہوا۔ عالمِ شوق میں سراپا انتظار رہی تھا کہ وزیر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا:—

"اس میں شک نہیں کہ تم نے طلبِ صادق کا حق ادا کیا ہے لیکن ایک آخری شرط اور رہ گئی ہے اسے بھی پوری کر دو تو تمہاری درخواست قطعی منظور کر لی جائے گی۔ یقین کرو! تمہارے جذبۂ صادق کی یہ آخری آزمائش ہے، بالکل آخری"

توقع کے خلاف وزیر کا یہ جواب سُن کر فقیر کے تصورات کی دنیا بکھر گئی۔ یکایک دل کی ساری امنگوں کا خون ہو گیا۔ لیکن وہ عشق ہی کیا جس میں پیہم ناکامیوں کی چوٹ نہ کھانی پڑے۔ ہمت ہارنا رہِ الفت کے مسافر کا شیوہ نہیں ہے۔

پھر اُس نے ٹوٹی ہوئی امیدوں کو سمیٹا اور وزیر سے دریافت کیا:—

"اچھا اب وہ آخری شرط کیا ہے؟"

وزیر نے جواب دیا:—

"شہزادی کے کان کے آویزوں کے لئے دو ایسے بڑے بڑے موتی مطلوب ہیں جو رنگت و تابش میں ساری دنیا کے لئے بے مثال ہوں"

فقیر آج دوسری مرتبہ گھائل ضرور ہوا تھا لیکن اس کے باوجود مایوس نہ تھا۔ مگر آج کی رات پشیمانیوں کی خلش اور مناجات کی گریہ وزاری میں کٹی۔ صبح ہوئی تو خدا کا نام لیکر اٹھا اور جنونِ عشق کی آخری مہم پر روانہ ہو گیا۔ لگاتار کئی دن چلنے کے بعد ایک سمندر کے کنارے پہونچ کر دم لیا۔ عشق کی نکمہ پیما ہمت بھی کیا قیامت ہوتی ہے۔ اپنے تئیں آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ سمندر کو خشک کر کے تہہ میں چمکنے والے موتیوں کا سراغ لگائے گا۔ اس یقین کے جذبہ میں دونوں ہاتھوں سے اس نے سمندر کا پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ اسی عالمِ جنوں خیز میں کئی دن گذر گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو پہاڑوں کی طرح سر اٹھاتی ہوئی موجوں کا وہی عالمِ شباب تھا۔ لیکن قربان جایئے عقیدۂ عشق کی حیرت گری کے کہ اتنی کھلی ہوئی ناکامی کے باوجود سمندر پر فتح پانے کا عزم ذرہ برابر متزلزل نہیں ہوا تھا

تو خود مجھے فرصت تھی۔ دار پر چڑھنے کے لئے تم سے زیادہ میں بے قرار ہوں۔ انتظار کا ایک ایک
لمحہ میرے لئے قیامت ہو رہا ہے۔ جو خیال تم نے اپنے متعلق ظاہر کیا ہے بس وہی خیال مجھے
بھی یہاں لایا تھا۔ میرے پاس کوئی خنجر نہیں تھا۔ جان دینے والے کو جان لینا کہاں آتا ہے! جو
خود جام شہادت نوش کرنا چاہتا ہو وہ یہی جام بھلا دوسروں کے سامنے کیسے بڑھا دے گا؟

اب احمد نے محسوس کر لیا کہ ان دونوں میں مفاہمت ہو گئی اور اب دونوں پر یہ راز منکشف
ہو گیا تھا کہ واردات قتل کے وقت ذہن میں جو چمک پیدا ہوئی تھی وہ کیسی تھی؟

آخر فیصلہ کا دن آ ہی گیا۔ قانون کی نگاہ میں دونوں مجرم ثابت ہوئے اور دونوں ہی کے
لئے پھانسی کی سزا تجویز کی گئی۔

آج شہر کی ساری آبادی عین پور جیل کے گرد سمٹ آئی تھی ہر کوئی اشکبار آنکھوں سے
ان دونوں کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چہرہ جن پر تقدس برس رہا تھا۔ معصومیت
قربان ہو رہی تھی۔ تقدس برستا رہا، معصومیت لٹتی رہی اور لوگ ان کا آخری دیدار کرتے رہے۔
—— سارے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف تھیں۔ لیکن یہ دونوں کسی اور طرف دیکھ رہے
تھے۔ ان کی نگاہیں بار بار ایک طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں۔ دفعتہً ان کے چہروں پر اضطراب کی
ایک کیفیت نمودار ہوئی اور ان کا چہرہ اتر گیا۔

ان دونوں کا آخری دیدار کرنے کے لئے ان دونوں کی مائیں بھی پیش دست آ گئی تھیں اور
اس وقت یہ دونوں بھی دیکھنے والوں کی صف میں کھڑی تھیں۔ جب انہوں نے ان دونوں کی یہ
حالت کا اندازہ کیا برس پڑیں۔

"دم آخر چہروں پر حزن و ملال کے آثار کیوں؟ زندگی جب اتنی ہی پیاری تھی تو موت کو
دعوت کیوں دی تھی؟ کیا اللہ والوں کا یہی وطیرہ ہے؟ شیدائیان رسول کا ایسا ہی کردار ہوتا ہے؟
سرفروش اس طرح جان دیتے ہیں —؟ خبردار! جو چہرے پر غم کی کیفیت پیدا ہونے دی۔
یاد رکھو! اگر تم نے ہنستے ہوئے جان نہیں دی۔ اگر دار و رسن کا پرتپاک خیر مقدم نہیں کیا۔
اگر مسکراتے ہوئے جام شہادت نہیں نوش کر سکے تو ہم تمہارا دودھ کبھی نہیں بخشیں گی۔

تم کو خوش ہونا چاہیئے کہ آج تم اس سعادت سے بہرہ ور ہو رہے ہو، جو ہر کسی کا مقسوم نہیں ہے۔

؎ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"

امیر احمد اور حامد ایک ساتھ بول اٹھے: "چچا جان یہ جو اضطراب آپ کے چہرہ پر نظر آ رہا ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم لوگ جان سے جا رہے ہیں۔ ہمارے چہروں پر غم کی گھٹن اس لئے نہیں چھائی ہے کہ ہم تختۂ دار پر چڑھنے والے ہیں۔ ہماری پریشانیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ جام شہادت پیش کرنے میں لوگ دیر کیوں کر رہے ہیں؟ ہماری نگاہیں اس وقت جو کچھ دیکھ رہی ہیں اگر آپ دیکھ لیجئے تو آپ بھی ہماری جگہ آنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کے اطمینان کے لئے ہم اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہماری منزل مل گئی ہے۔ ہمارے آقا کی کل اولاد ہمارے سامنے کھڑے اپنے ہاتھوں کے اشارے سے ہمیں پاس بلا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے انکے درمیان شرط یہ ٹھہری ہے کہ ہم جام شہادت نوش کرنے کے بعد ہی ان تک پہونچ سکیں گے۔"

پھانسی کا پھندا آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وہ ہنستے ہوئے جان دے رہے تھے۔ انہوں نے جان دے ڈالی وہ دونوں شہید ہو گئے۔ رحمت کی گھٹائیں ان پر برس پڑیں اور وہ ان میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے۔

جنت کے جانے والے! جنت کا سفر مبارک ہو۔ اس کی سرمدی راحتیں مبارک ہوں، ابدی نعمتیں مبارک ہوں۔

ان شہیدان محبت کی آخری آرام گاہ ایک ہی ساتھ کھمرگاؤں قبرستان میں ہے۔ جہاں سے نامرادان کو مرادیں ملتی ہیں اور غمزدہ مسرت و شادمانیوں سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

ضیاء جالوی

آستانۂ رحمت سے گلشن جناں تک

(۱)

دل کے دروازے پر ہوش کا چراغ جلا دیا جائے، عقل کا پاسبان بٹھا دیا جائے، داخلے کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں، پوری ناکہ بندی کر دی جائے لیکن محبت وہ غنیم ہے کہ جب یلغار پر اُتر آئے تو چراغ بجھ جاتا ہے، پاسبان ہٹ جاتا ہے، راہ کی رکاوٹیں خیر مقدم کو کھڑی ہو جاتی ہیں۔ دل میں اتر آتی ہے تو خودسرانہ انداز میں آتی ہے۔ پیشانی پر غرورِ حاکمیت کا بل ہوتا ہے۔ گیسوئے دراز میں بلا کی ساحری ہوتی ہے۔ بال بال سے خمار ٹپکتا ہے۔ چشم زدن میں پوری کائنات مسخر ہو جاتی ہے! مسحور ہو جاتی ہے، جدھر اس کا اشارہ ہو نگاہ ادھر جھکے جدھر اس کا حکم ہو دل ادھر اٹھے۔

یہی حال اس نوجوان کا بھی ہوا۔ محبت نے عقل و ہوش کو تاراج کر کے اس کے دل پر فرمانروائی شروع کر دی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا، کمر بہت جھکنے لگی۔ غم کی شدت ایسی تھی کہ زندگی کے تمام ذائقے پھیکے پڑ گئے۔ دن ہوتا اور یادِ حبیب ہوتی، رات ہوتی اور تصورِ جاناں ہوتا۔ چنگاری جب اپنی حقیر حیثیت میں نہ بجھائی جا سکی تو شعلہ پہ آب چڑھ جانے کے بعد کون بجھا سکتا ہے؟

وہ معمولاً ہر شام کو کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ جاتا۔ دور دور تک دیکھتا، اسے ایسا محسوس ہوتا کہ میدان کے حاشیہ پر عشق کا سبزہ پھیلتا جا رہا ہے۔ محبت کے پودے اگ رہے ہیں، چراگاہوں سے اونٹوں کی قطاریں آتیں۔ بھیڑ بکریوں کے جھنڈ گزرتے۔ کبھی کبھی ریوڑ سے بھیڑیں منتشر ہو جاتیں، لیکن چرواہے کی آواز پر دوڑ پڑتیں۔ اونٹ بدک جاتے، لیکن ساربان کے اشارے پر سنبھل جاتے۔ وہ سوچتا، حیوانات میں پراگندگی ہوئی یا بکھری تھی، لیکن وہ سمٹ رہے ہیں۔

اور بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ بارگاہ نبوت میں حاضری دی اور سلام کے بعد عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! میں غریب ہوں، میرے پاس درہم و دینار نہیں ہیں کہ غزوۂ تبوک کی تیاری میں جاں نثاران اسلام کی طرح پیش کروں، لیکن چندہ میں کچھ نہ کچھ دے کر میں بھی حاضر ہوا ہوں۔ یا رسول اللہ! آپ کے قدموں پر اپنا دل و جگر اور آپ کی ٹھوکروں میں اپنا سر پیش کر رہا ہوں، قبول کیجیے اور دعا فرمائیے کہ میں بھی راہِ خدا میں شہید ہو جاؤں!"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جاؤ! کسی درخت کا چھلکا اتار لاؤ" ——— جب عبداللہ رضی اللہ عنہ چھلکا لے آئے تو حضور نے وہ چھلکا ان کے بازو پر باندھ دیا۔ اور زبان مبارک سے فرمایا، "الٰہی میں کفار پر اس کا خون حرام کرتا ہوں!"

عبداللہ نے کہا "یا رسول اللہ! میں تو شہادت کا طالب ہوں" غیب داں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب خدا کی راہ میں تم نکلو اور پھر تپ آ جائے اور مر جاؤ تب بھی تم شہید ہی ہو گے!"

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار کی جمعیت لے کر تبوک کو روانہ ہوئے، مدینہ میں محمد بن مسلمہ انصاری کو خلیفہ بنایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اہلبیت کی ضروریات کے لئے مقرر فرمایا۔ لشکر میں سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ اٹھارہ مجاہدوں کے لئے ایک اونٹ مقرر تھا۔ رسد کے نہ ہونے کی وجہ سے اکثر جگہ درختوں کے پتے کھانے پڑتے جس سے ہونٹ سوج گئے تھے۔ بعض جگہ پانی ملتا ہی نہیں۔ تبوک پہونچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن قیام فرمایا۔ اہل شام کے دل رسالت پناہی کے دبدبہ سے دہل اٹھے، اور دیارِ عرب پر حملہ آوروں کا خیال منسوخ کر دیا۔

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں ایک ماہ قبل مستقبل سے متعلق جو پیش گوئی کی تھی حرف بحرف پوری ہوئی۔

تبوک پہونچ کر جناب عبداللہ کو تپ چڑھی، اور بخار ہی کو سدھار گئے۔ بلال بن حارث مزنی نے عبداللہ کے دفن کی چشم دید واقعہ بیان کی ہے۔

"رات کا وقت تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں چراغ تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ کی لاش کو لحد میں رکھ رہے تھے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی قبر میں اترے ہوئے تھے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے فرما رہے تھے۔ "اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر اینٹیں بھی اپنے ہاتھ سے رکھیں اور دعا میں فرمایا۔—

"الٰہی! آج کی شام تک میں اس سے راضی رہا ہوں، تو بھی اس سے راضی ہو جا"

اللہ اللہ کیا وقت تھا کہ ایک مرحوم کو رحمت رحمٰن کے حوالے کر رہی تھی۔ حضرت مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "کاش! اس قبر میں میں دفنایا جاتا!"

میرا خیال ہے کہ اس موقعہ پر ہر صحابی کے دل میں احساس تھا:

"یہی موت مرنے کو جی چاہتا ہے۔"

مولانا ابو الوفا صاحب [illegible] پریس

دنیائے اسلام کا مایہ ناز فرماں روا خلیفہ ہارون رشید بغدادی جس کے رعب و جلال سے
دنیا کے تین حصے ہمیشہ متاثر رہے۔ فارس، روم اور یورپ کے سلاطین جس کی چوکھٹ
کے باجگذار کہلاتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔

زبیدہ خاتون اسی نیک نام بادشاہ کی پاک طینت وفا سرشت اور فیض رساں بیوی تھی۔
کہنے کو تو وہ ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ تھی۔ لیکن اس کے پہلو میں نہایت مسکین،
پرسوز اور دردمند دل تھا۔

اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگوں سے وہ بے پناہ عقیدت رکھتی تھی۔ مقدس مقامات
کی زیارت اور مزارات طیبات کی حاضری اس کی زندگی کے محبوب ترین مشاغل رہے تھے۔
مکہ معظمہ میں نہر زبیدہ نام کا صاف و شیریں چشمہ اس کے جذبۂ عقیدت
کی یادگار ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب بغداد میں ہر طرف سلطان العاشقین حضرت بہلول
دانا رحمۃ اللہ علیہ کے عشق و سرمستی اور جذب و استغراق کا ڈنکا بج رہا تھا ایک دیوانۂ عشق کے
پیچھے پیچھے کھنڈروں اور صحراؤں میں پروانوں کا ہجوم سایہ کی طرح رواں دواں رہتا
تھا جہاں بیٹھ گئے دنیا بس گئی۔ اُٹھے تو شہر اجڑ گیا۔

نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو اب ڈھونڈیئے ان کو چراغ رُخِ زیبا لے کر اور کہیں مل
گئے تو عالم ایسا کہ ملنا نہ ملنا دونوں برابر۔ ہزاروں کے بیچ لیکن تنہا خیال یار کے سوا کوئی
شریک جہاں نہیں دل کی دھڑکنوں سے قریب لیکن دُور بہت دُور سرحد امکاں سے
اس پار۔ قدم قدم پر عشق بے نیاز کا جلوہ۔ ادا ادا میں شان استغنا کا ظہور اس

" رات کا وقت تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں چراغ تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ کی نعش کو لحد میں رکھ رہے تھے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی قبر میں اترے ہوئے تھے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے فرما رہے تھے۔ "اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر اینٹیں بھی اپنے ہاتھ سے رکھیں اور دعا میں فرمایا:—

" الٰہی! آج کی شام تک میں اس سے راضی رہا ہوں، تو بھی اس سے راضی ہو جا"

اللہ اللہ کیا وقت تھا کہ ایک مرحوم کو رحمت رحمٰن کے حوالے کر رہی تھی۔ حضرت مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "کاش! اس قبر میں میں دفنایا جاتا!"

میرا خیال ہے کہ اس موقعہ پر ہر صحابی کے دل میں احساس تھا:

"یہی موت مرنے کو جی چاہتا ہے"

مولانا بزواری صاحب نقشبندی غازی پوری

دنیا نے سب سے بڑا نازفرماں روا خلیفہ ہارون رشید بغدادی جس کے رعب و جلال سے دنیا کے تین حصے ہمیشہ متاثر رہے۔ فارس، روم اور یورپ کے سلاطین جس کی چوکھٹ کے باجگزار کہلاتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔

زبیدہ خاتون اسی نیک نام بادشاہ کی پاک طینت وفا سرشت اور نیک نفس بیوی تھی۔ یہ کہنا کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ تھی لیکن اس کے پہلو میں نہایت مسکین، پرسوز اور دردمند دل تھا۔

اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگوں سے وہ بے پناہ عقیدت رکھتی تھی۔ مقدس مقامات کی زیارت اور مزارات طیبات کی حاضری اس کی زندگی کے محبوب ترین مشاغل تھے۔ مکہ معظمہ میں نہر زبیدہ جو نہ صرف رشید کی چشمہ ہے اس کے جذبۂ عقیدت کی یادگار ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ بغداد میں ہر طرف سلطان العاشقین حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کے عشق و مستی اور جذب و استغراق کا ڈنکا بج رہا تھا ایک دیوانہ عشق جس کے پیچھے پیچھے کھنڈروں اور صحراؤں میں پروانوں کا ہجوم سیلاب کی طرح رواں دواں رہا کرتا تھا جہاں بیٹھ گئے دنیا بس گئی، اٹھے تو شہر اجڑ گیا۔

نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو اب ڈھونڈیئے ان کو چراغ رخ زیبا لے کر اور کہیں مل گئے تو ان کا ایسا رعب نہ ملنے دو نوں پر بر۔ ہزاروں کے بیچ لیکن تنہا خیال یار کے سوا کوئی شریک جہاں نہیں دل کی دھڑکنوں سے قریب لیکن دور بہت دور سرحد امکان سے اس پار۔ قدم قدم پر عشق بے نیاز کا جلوہ، ادا ادا میں شان استغنا کا ظہور تھا

عالم کیف ومستی کے ساتھ حضرت بہلول دانا دل کی ہزاروں بستیوں میں اُتر گئے تھے۔

زبیدہ خاتون بھی ان کے کشف وکرامات اور جذب وعشق کے قصوں سے بے حد متاثر تھی۔

زیارت کا شوق دبی ہوئی چنگاری کی طرح ہمیشہ سلگتا رہتا تھا۔ ہزار موقع تلاش کرنے پر بھی دل کا یہ ارمان پورا نہ ہوسکا۔ تخت وتاج کی ملکہ سے کسی دیوانۂ عشق کا رشتہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے محبوب حقیقی کے لئے جس نے دونوں جہاں سے منہ پھیر لیا ہو، وہ کسی اور کو کیوں دیکھے اور پھر جنون شوق کے ہاتھوں جسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ ہو اس کی بے اعتنائیوں کا شکوہ ہی کیا ہے؟

البتہ طبیعت کبھی نشاط پر ہو۔ وحشت عشق کا طوفان بھی تھم گیا ہو۔ اور جہان خاکی کی طرف توجہ مبذول کرنے کی فرصت بھی مل گئی ہو تو کچھ عجیب نہیں کہ اپنے کسی پروانہ کی طرف نگاہ اٹھ جائے اور اس کو زمین کی فیروزمندیوں سے سرفراز کر دیا جائے۔

ایک بار زبیدہ خاتون کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا اور وہ نہال ہوگئی۔

(۲)

چار بجے شام کا وقت تھا دن بھر کا تھکا ماندہ سورج اپنے مستقر کی طرف تیزی سے لوٹ رہا تھا۔ ہوا کی خنکی دل نشیں کی رہنمائی خوش گوار ہوتی جا رہی تھی یہی وقت تھا جب کہ زبیدہ خاتون تفریح کے لئے شاہی باغ میں جایا کرتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کنیز نے آکر اطلاع دی "حضور! ملکہ معظمہ سواری تیار ہے خوشبخت خیر مقدم کے لئے چشم براہ ہیں"

زبیدہ خاتون کنیزوں کے جھرمٹ میں اٹھی اور سواری میں آکر بیٹھ گئی۔

سواری محل کے دروازے سے نکل کر بغداد کی مختلف شاہراہوں سے ہوتی قریب ہی ایک شاداب صحرا کی طرف بڑھنے لگی تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی درخت اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک وادی کے نشیب سے گزرتے ہوئے اچانک ایک کنیز کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔

تک دو دیکھے حضرت بہلول دانا جھاڑیوں کے درمیان کچھ چن رہے ہیں۔ زبیدہ چونک گئی۔ خوشی سے دل چھلنے لگا۔ مُنے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو بکھرے ہوئے بال پراگندہ پیراہن اور حیرت زدہ چہرے کے ساتھ ایک شخص پتھر کے ٹکڑوں کو جمع کر کے کچھ بنا رہا تھا۔ سواری روک دی گئی۔ اضطراب شوق کے عالم میں زبیدہ تڑپ گئی اور لرزتے کانپتے جھجکتے ڈرتے ہوئے قدم آگے بڑھایا۔

ہمت کر کے سامنے پہونچی اور مؤدب کھڑی ہو گئی۔ حضرت بہلول دانا پتھروں کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنانے میں اس درجہ منہمک تھے کہ انھوں نے آنے والی کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں فرمائی۔

ایک گم گشتہ حال دیوانہ عشق کو نظارۂ جمال یار سے اتنی کہاں فرصت کہ نگاہ اٹھا کر کسی اور کو دیکھتا۔

بادشاہ وقت کی ملکہ جس کے سامنے کھڑی تھی وہ خود ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا۔ اس کی ابرو کی شکن پر بادشاہتوں کی تقدیر ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی اس کی حکومت کا رقبہ جہان فانی سے لے کر عالم جاوید تک پھیلا ہوا تھا۔

زبیدہ امید و بیم کے عالم میں دیر تک سر جھکائے کھڑی رہی خود ہی ہمت کر کے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا:

السلام علیکم۔

یہ الفاظ شہنشاہ کونین، ختم پیغمبراں کی شریعت مطہرہ کے تھے سنت رسول کے احترام میں دیوانہ اپنے عالم سے پلٹ آیا۔ حیرت عشق کی شراب ناب سے مخمور آنکھیں اوپر اٹھیں اور دل کا شور ہیبت بھری آواز میں جواب دیا:

وعلیکم السلام!

لب و لہجہ کے جلال سے فضا لرز گئی۔ زبیدہ کا نرم و نازک دل کانپ گیا۔ کچھ وقفہ

کے بعد ہمت بندھی حوصلہ بڑھا اور امید ہو گئی کہ آج ساقی مائل بہ کرم ہے دوبارہ عرض کیا:

"حضور یہ کیا بنا رہے ہیں؟"

دیوانے کے رازداں سے یہ سوال کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ ہزار عیار اہم ہونے کے باوجود بھی سلطنت کے رموز بتانے کے نہیں ہوتے۔ اقلیم باطن کا سلطان کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے۔ اس کی شام و سحر کہاں بسر ہوتی ہے یہ سر تا سر کائنات عشق کے اسرار ہیں محرم راز کے سوا انھیں کوئی نہیں جان سکتا۔

زبیدہ خاتون کا سوال بھی بالکل اسی طرح تھا۔ وہ ایک دیوانۂ عشق سے عالم حقیقت کا راز فاش کرانا چاہتی تھی جس کا مسئلہ عالم امر سے ہے۔

اس مصلحت ناشناس سوال پر حضرت بہلول دانا کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ پیشانی کی سطح خاموش پر شکن ابھر آئی۔

یہ کیفیت دیکھ کر زبیدہ دہشت زدہ ہو گئی لیکن سوال کے پیچھے اسے اپنے دل کے اخلاص و عقیدت کا یقین تھا اس لئے نتائج کی طرف سے وہ بالکل مطمئن تھی۔

پھر اچانک دیکھا کہ چہرے کے تیور بدل گئے۔ پیشانی کی شکن مٹ گئی۔ لالہ کے ورق پر شبنم کی نمی ابھر آئی کرم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور حضرت بہلول دانا نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے فرمایا۔ — "کیا بنا رہا ہوں۔ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے تو یقین کر کہ میں فرش گیتی پر جنت کا محل بنا رہا ہوں۔"

ایمان اور عقیدت کی سرمستی اور فیضان عشق کی برتری بھی کیا چیز ہوتی ہے۔

عقل فتنہ پرداز جسے دن کی طرح روشن حقیقتوں کا انکار کرتے ہوئے ذرا دیر نہیں لگتی۔ یہاں پہنچ کر اس کی رہبری کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔

عقل فریب کار کے مشورے پر دانشوروں کا قافلہ اپنی راہ بدل دیتا ہے لیکن ہزار نشیب کے بعد دیوانہ جادۂ حق سے کبھی نہیں ہٹتا عقیدت و عشق سرحد یقین جہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں عقل درماندہ شعور کا چراغ بجھ جاتا ہے۔ بحث و دلیل سے بے نیاز اس نے اقلیم میں داخلے کا پروانہ اسے آج تک نہیں مل سکا۔ زبیدہ خاتون کو یہ یقین کرنے

میں ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ اینٹ اور پتھر کا یہ گھروندا یقیناً فرشِ گیتی پر جنّت کا محل ہے۔ اپنی آنکھ کا دیکھا غلط ہو سکتا ہے لیکن ایک عارف عشق کی بات کبھی نہیں غلط ہو سکتی۔

اس یقین کے نتیجے میں پھر اس نے سوال کیا —— "حضور! جنّت کا یہ محل میرے ہاتھ پر فروخت کریں گے؟"

جواب تھا —— "ضرور فروخت کروں گا"

ذرا نازِ بندگی کا تماشہ دیکھیے جنت کس کی اور فروخت کون کر رہا ہے۔ سچ فرمایا ہے جانِ عاشقاں صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے کہ "جو خدا کا ہوتا ہے خدا اس کا ہوتا ہے۔"

اب اس تشریح کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ جب خدا ہی اس کا ہو گیا تو اب کائنات میں باقی کیا رہ گیا۔ دشوار گزین کی تسخیر کا مرحلہ نہیں ہے، دراصل سب سے مشکل کام خدا کو راضی کرنا ہے۔ خدا کے محبوب مطلق صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی خوشنودی کا حصول ہے۔ بادشاہ کے تئیں مقرب و معزز ہو جانے کے بعد رعایا کی تسخیر کا سوال ہی نہیں اٹھتا —— اس جواب پر زبیدہ خاتون کی رُوح جھوم اٹھی اس پُراُمید لہجے میں پھر دریافت کیا —— "کتنی قیمت پر فروخت کریں گے یہ جنّت"

جواب دیا —— "ایک درہم پر"

ذرا رحمتِ یزدانی کی یہ ادا تو دیکھیے۔

برادرِ ست خرید و تو جنّت کی قیمت پوری جان۔ اجنبی سے لینا چاہو تو ایک درہم۔ میدانِ جہاد کے شہیدان کا حال یہ ہے کہ ایک بار جان دی ایک جنّت کے مستحق ہو گئے۔ لیکن جو یہ تن خنجرِ تسلیم در رضا کے شہید ہو کر مرتا اور جیتا ہے اور پھر شہید ہوتا ہے یہ شہادت پیرانِ کشتگانِ عشق کو جو جنتیں ملتی ہیں انھیں اختیار ہے یونہی دیدیں قیمت لگا دیں بخشی ہوئی جنّت کو جو چاہیں سو کریں۔ اپنی چیز اپنی مرضی۔

جواب سنتے ہی زبیدہ نے فوراً قیمت پیش کر دی۔ قیمت ادا ہو جانے کے بعد حضرت بہلول دانا نے ایک لکڑی اٹھائی اور ایک گھروندے کے گرد خط کھینچتے ہوئے

"میں نے جنّت کا یہ محل ایک درہم کے عوض زبیدہ خاتون کے ہاتھ بیچ دیا۔"

یہ سنتے ہی زبیدہ خاتون اس یقین کی خوشی میں سرشار ہو گئیں کہ اسے جیتے جی جنت مل گئی۔
زمین خدمت چوم کر جب وہ اپنی سواری کی طرف واپس لوٹ رہی تھی تو اپنے نصیبے کی
ارجمندی پر اس طرح نازاں تھی جیسے دنیا میں اب اس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔

آج میکدۂ عشق کے ایک بادہ نوش نے اس کی آفرینش کا سب سے نازک ترین مرحلہ
طے کر دیا تھا۔ مرنے کے بعد اپنا انجام وہ خود بیان کر دینے کے قابل ہو گئی تھی اسے قطعی
طور پر یقین تھا کہ موت کی آخری ہچکی تک جنت کا استحقاق باقی رہے گا۔

فضا میں شام کی سیاہی پھیل گئی تھی لیکن وہ فیروز بختی کے اجالے میں شاہی محل
واپس ہوئی۔

(۳)

نصف رات کا پچھلا پہر تھا۔ سارے محل پر رات کی خموشی چھائی ہوئی تھی۔ دور کہیں
کہیں سے پاسبانوں کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بغداد کا حسین و دلکش شہر
دھلی ہوئی چاندنی میں نہا نہا کر اور نکھر گیا تھا۔ جا بجا کنگورہ ایوان کے سنہرے گنبدوں
سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھی۔ زمین سے آسمان تک ساری فضا تجلیات کے نور سے
جگمگا رہی تھی۔

نماز تہجد اور مناجات نیم شبی سے فارغ ہو کر زبیدہ خاتون اپنے حرم سرا میں محو خواب
تھی۔ دروازے کے باہر کنیزان خصوصی کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ یکایک قدموں کی آہٹ پر ایک
کنیز چونک گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو بے وقت ہارون رشید دبے پاؤں چلے آ رہے تھے۔
خلافت مآب تشریف آوری پر کنیزیں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں — ہارون رشید
نے آگے بڑھ کر زبیدہ کی خوابگاہ کے دروازے پر دستک دی۔ زبیدہ کی آنکھ کھل گئی۔
رات کے سناٹے میں دروازے پر دستک زندگی کا غیر معمولی حادثہ تھا
گھبرائی ہوئی اٹھی اور دروازہ کھولا۔

ہارون رشید کو دروازے پر دیکھ کر ششدر و مبہوت ہو گئی۔ سکتے کی حالت میں اس
نے بادشاہ کا خیر مقدم کیا اور اندر لے آئی۔

گذرگاہوں میں اُجالا پھیل رہا تھا، میرے دل نے گواہی دی ہو نہ ہو یہ کوئی فرشتہ ہے۔

آگے بڑھ کر میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کون سی جگہ ہے، بہت تیزی سے وہ یہ کہتے ہوئے گذر گیا "جنت الفردوس"۔

جواب سن کر میرا دل خوشی سے اُچھلنے لگا اپنے نصیبے کی ارجمندی پر ناز کرتا ہوں ہی آگے بڑھا سامنے بلند قامت دروازے کی پیشانی پر نظر پڑی اس پر بخط سبز لکھا ہوا تھا "زبیدہ خاتون" یہ تحریر پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دروازے کے اندر داخل ہوا تو جس عمارت پر بھی نظر پڑی — "زبیدہ خاتون" کا نام جھلک رہا تھا۔

دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ زبیدہ خاتون تو میری محبوب ملکہ کا نام ہے۔ ہو سکتا ہے کہیں آس پاس میرا نام کندہ ہو۔ اسی آرزو کے شوق میں میلوں دُور تک نکل گیا۔ لیکن ہر جگہ زبیدہ خاتون کا نام نظر آیا — خواب سے بیدار ہونے کے بعد تعبیر کے تجسس نے مجھے تنی بھی مہلت نہیں دی کہ میں صبح ہونے کا انتظار کرتا۔

زبیدہ خاتون سے مراد اگر تمہاری ہی ذات ہے تو یقیناً تم قابل رشک ہو خدا کے لئے مت نہو تو اپنی زندگی کا وہ راز بتا دو جس نے جیتے جی تمہارا نام باغ فردوس تک پہنچا دیا ہے۔

زبیدہ خاتون کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا اس نے فرحت کے لہجے میں جواب دیا مجھے اپنے نامۂ زندگی کا کوئی ایسا عمل نہیں یاد آرہا ہے جسے خدا کی اس عظیم الشان نعمت کا اجر قرار دوں۔

البتہ آج شام کو اچانک اپنے وقت کے مشہور مجذوب حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہو گئی تھی۔ وہ ایک ویرانے میں اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنا رہے تھے کچھ دیر انھیں مٹی سے کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ان سے دریافت کیا۔ اے بہلول یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟ جواب دیا جنت کا محل۔ پھر پوچھا بیچئے گا؟ جواب دیا ضرور بیچوں گا۔ اس کے بعد میں نے ایک درہم ان کی منہ مانگی قیمت ادا کی۔ انھوں نے ایک گھروندے کے گرد خط کھینچتے ہوئے کہا — جنت کا یہ محل میں نے زبیدہ خاتون کے ہاتھ پر بیچ دیا۔

ہارون رشید یہ سن کر پھڑک اٹھا اور جوش عقیدت میں بول اٹھا: ———

"یقیناً یہ نیکی کی زبان کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی بات کبھی رائیگاں نہیں کرتا۔ روئے زمین پر یہ مقدس ہستیاں خدا کی شانِ رحمت ہی کا پرتو ہیں۔ ان کی پیشانی کی موجوں میں صفاتِ حق کا عکس نظر آتا ہے۔ کارکنانِ قضا و قدر ان کی زبانوں پر کلام کرتے ہیں — خلافتِ الٰہی کے منصب نے انھیں کونین کا فرماں روا بنا دیا ہے۔ بلاوجہ امتِ محمدی ان کے پیچھے نہیں دوڑتی۔"

یہ کہتے کہتے ہارون رشید کا لہجہ بدل گیا۔ آواز بھرا گئی اور اس نے گذارش و التجا کے انداز میں کہا — "تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک دن مجھے ان کی سرکار میں لے چلو۔ نصیبے کی کامرانی نے ساتھ دیا تو ہوسکتا ہے کہ میں بھی جیتے جی جنت کا حقدار بن جاؤں۔"

زبیدہ نے پرتپاک انداز میں جواب دیا — "ضرور چلئے۔ جنت میں آپ کی رفاقت کا اعزاز حاصل کرکے میرے دل کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔"

(۴)

صبح کا سہانا وقت تھا۔ رات ہی سارے محل میں یہ خبر گرم تھی کہ بادشاہ ملکہ کے ہمراہ سیر و سیاحت کے لئے تشریف لے جائیں گے۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے دونوں اپنے مقدس سفر پر روانہ ہوگئے۔ حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کی تلاش کوئی آسان بات نہ تھی۔ ان کا مل جانا حسنِ اتفاق کا کرشمہ کہا جاسکتا تھا۔ سارا دن ویرانوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے لیکن کہیں ان کا سراغ نہیں لگ سکا۔ تھکے ماندے شام کو محل واپس لوٹ آئے۔ پھر ایک دو روز کے وقفہ کے بعد ان کی تلاش میں نکلے اور دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد ناکام واپس آئے۔

اس طرح لگاتار کئی دن کی ناکامیوں کے بعد ایک دن پہاڑ کے دامن میں حضرت بہلول دانا مل گئے — آج بھی ان کا وہی عالم تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور دونوں جہاں سے بے نیاز پتھر کے ٹکڑے جمع کرکے گھروندے بنانے میں منہمک تھے۔

زبیدہ خاتون نے دور سے اشارہ کیا۔ نظر پڑتے ہی ہارون رشید پر لرزہ طاری ہوگیا۔ قدم اٹھانا مشکل تھا۔ آگے بڑھنے کی ہمت جواب دے گئی۔

اللہ اللہ! ساری دنیا جس کے دربار کی جلالتِ شان سے لرزہ براندام رہا کرتی آج ایک

فرما دیا جائے۔"

عجز و درماندگی کی اس التجا پر حضرت بہلول دانا کا دل مہر و شفقت کے گداز سے بھر گیا۔ آپ نے اسی عالم میں جواب مرحمت فرمایا:——

"جذبۂ دل و مستی کے کیف و دوام نے مجھے دونوں جہاں کی لذتوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں تیری سلطنت لے کر کیا کروں گا۔ دل تو بڑی چیز ہے سلطنت کے لئے آ میری ٹھوکروں میں بھی جگہ نہیں ہے۔ جا اپنی سلطنت بھی لے جا اور جنت کا یہ پروانہ بھی رکھ لے۔

درویش کا مقصود دل کو حرص و ہوس کی زنجیروں سے آزاد کرانا تھا۔ ایک درہم اور پوری سلطنت دونوں کے درمیان اس کی نگاہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے دل کے یقین اور عقیدت کے اخلاق کا ہے۔"

ہارون رشید جب خلعت جاوید سے سرفراز ہو کر واپس ہوا تو زبیدہ خاتون نے دریافت کیا—— "میں حیران ہوں کہ آپ کو جنت کے حصول پر مبارکباد دوں یا دل کے نئے عالم پر؟"

ہارون رشید نے جواب دیا——

"والیٔ کشورِ عشق کی سرکار سے دل کو جو نیا عالم عطا ہوا ہے۔ دراصل عالم آخرت کے سارے اعزاز کی کلید یہی ہے۔"

علامہ ارشد القادری
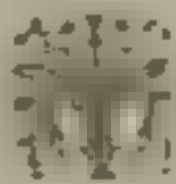
ادائے رحمت

زندگی سوزِ محبت سے سنورتی ہے ادیب
غم سلامت ہے تو مٹی مری برباد نہیں

رات خوفناک حد تک سیاہ تھی اور فضائے عالم پر مکمل سکوت طاری تھا۔ رات کے سناٹے میں ایک بندۂ خدا کمال جذبۂ عبودیت کے ساتھ سربسجود تھا۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے:

"میرے معبود! میری سینکڑوں راتیں تیری بارگاہِ بے نیاز میں عرض نیاز کرتے گذر گئیں۔ لیکن آج تک میری وہ ایک آرزو بھی پوری نہ ہو سکی جس کے لئے اب تک سینکڑوں آرزوؤں کا خون کر چکا ہوں۔ کعبۂ مقصود تک پہونچنے کے لئے میں نے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ منزلِ مراد کی تلاش مجھے کہاں کہاں نہ لے گئی۔ لیکن آج تک نہ منزلِ مراد کا سراغ مل سکا نہ کعبۂ مقصود تک رسائی ہو سکی"

وہ دعائیں مانگ رہا تھا اور رو رہا تھا، رو رہا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ مسلسل ہچکیوں کے سبب اس کی آواز کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا تھا۔ پھر بھی اس کے دونوں ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھے رہے۔ وہ دعائیں مانگتا ہی رہا

"یارب! میں تجھ سے ایک ادنیٰ اور حقیر سی شے طلب کر رہا ہوں۔ بحرِ ناپیدا کنار سے ایک قطرۂ بے مایہ ہی مانگ رہا ہوں، میخانہ بردوش ساقی سے دردِ تہ جام ہی کی درخواست کی ہے، خانہ بر انداز چمن سے پھول کی ایک پنکھڑی ہی کا طلبگار ہوا ہوں۔

میرے رزاق! میں حج کرنا چاہتا ہوں، میں تیرے ہی گھر کی زیارت اور اس

کا طواف کرنے کا آرزومند ہوں۔ میں غلافِ کعبہ کو اپنی آنکھوں سے لگانا چاہتا ہوں۔ میں اس پانی سے وضو کرنا چاہتا ہوں جو تیرے ہی ایک محبوب بندے کی ٹھوکر سے پیدا ہوا ہے۔ میں اس سرزمین مقدس کا بوسہ لینا چاہتا ہوں جس کو تیرے حبیب نے "روضة من ریاض الجنة" کہا ہے اور وہاں میں ان ذرات کو بھی چومنا چاہتا ہوں جن کو تیرے حبیب کی پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ میں خطۂ محترم کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں جہاں خدیجہ اور زینب جیسی خاتونیں حق نقش گم کردہ آئے ہیں؛

رات دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی تھی۔ صبح کی نورانی شعاعیں آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ اور کھڑکیوں سے کمرے میں اترنے لگی تھیں لیکن اس کے ہاتھ دعا کے لئے اب بھی اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اب بھی بہہ رہی تھیں۔ وہ اب بھی سسکیاں بھر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:——

"رب العالمین! آج کئی برسوں سے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر میں نے کچھ پیسے جمع کئے ہیں۔ میں کئی کئی راتوں تک چند ٹکڑوں سے روزہ افطار کرکے روزے پہ روزے رکھتا رہا ہوں۔ اور اس طرح میں نے اپنے یومیہ اخراجات میں تخفیف کرکے کچھ پیسے بچائے ہیں۔ لیکن حج کرنے کے لئے وہ پیسے اب بھی ناکافی ہیں۔ گھر کے تمام ظروف میں نے بیچ ڈالے گھر کے سارے سامان بھی میں نے بیچ دیئے۔ اس کے باوجود میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہو سکے جو سفرِ حج کے لئے زادِ راہ بن سکیں۔ میرے پاس دو اونٹنیاں ہیں۔ خیال تھا ایک اونٹنی اپنے خاندان کی ضرورت کے لئے رکھ چھوڑوں اور ایک بیچ دوں۔ لیکن اس کی اتنی قیمت نہیں لگ رہی جو زادِ راہ کی کمی پورا کر سکے — خداوندا! تو میرے لئے غیب سے زادِ راہ مہیا کر اور میرا حج قبول فرما!"

ابھی وہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اور ایک آنے والے نے "السلام علیکم" کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے——

اس نے کہا—— "اس دن آپ کی اونٹنی کی قیمت لگانے میں مجھ سے بھول ہوگئی میں

اٹھا اور پڑوسی کے گھر پہونچا ـــ پڑوسی سے اس نے کہا: ـــــ

" ابھی تک تو ہم مسلمانوں میں یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ جب کسی کو کوئی نعمت میسّر آتی ہے تو ساری برادری میں بانٹ کر کھاتے ہیں لیکن تم غالباً ایسے مسلمان ہو جو اپنے اُصول بھول گئے ہو۔ تم نے اپنے بزرگوں کی ریت ترک کر دی ہے اور معاشرے میں ایک نئی طرح ڈالنا چاہتے ہو ـــ اگر تم کو حقِ ہمسایگی کا پاس ولحاظ نہیں تھا۔ تو کم از کم مسلمانوں کی رسم ورواج ہی کا خیال کیا ہوتا؟ "

یہ سُنکر پڑوسی اپنی جگہ سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے اُس کے پاس آیا، دونوں دیر تک باہر کھڑے سرگوشیاں کرتے رہے اور پھر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

لیلائے شب نے ایک بھرپور انگڑائی لی اس کی کافر زلفیں اس کی بانہوں پر بکھر گئیں اور تاریک سائے چاروں طرف پھیل گئے۔ لیکن ان سایوں کے علاوہ ایک اور سایہ تھا جو آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھ رہا تھا۔ سایہ بڑھتا رہا، سایہ بڑھتا ہی گیا اور پھر پڑوسی کے مکان کے پاس پہونچکر فضا میں تحلیل ہوگیا۔ مسجد کے میناروں سے موذن کی صدائے تکبیر سے گونج اُٹھے۔ عازمین سفر نے رختِ سفر باندھا اور قافلے سے جا ملے۔ جرس کی آواز نے قافلے کی روانگی کا اعلان کر رہی تھی۔

دیارِ حبیب کے مسافر کو الوداع کہنے کے لئے گاؤں والوں کی ایک بھیڑ اس کے مکان کے گرد جمع تھی۔ لیکن خود وہ مسافر ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی پورے سامانِ سفر کے ساتھ اسے کئی کئی منزل تک پہونچانے کا عزم صمیم کر آئی تھی۔ عورتوں کی قطاریں اس کے پیچھے پیچھے چلنے کو تیار کھڑی تھیں، چھوٹے چھوٹے بچے اس عازم حج کے قدم لینے کو اپنے اپنے بستروں سے اٹھ آئے تھے۔ لیکن اس کے مکان کا دروازہ اب بھی بند تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا پروانوں کی بھیڑ اس پر ٹوٹ پڑی اور مبارک بادکی صداؤں سے فضا گونج اٹھی۔

اس کے لب کئی بار وا ہوئے۔ اور تھرتھرا کے رہ گئے۔ اس کے ہونٹوں کو کئی مرتبہ جنبش ہوئی لیکن اس کی آواز حلق ہی میں گھٹ کے رہ گئی۔ آخر بڑی مشکلوں سے اس نے اپنے

اوپر قابو پایا، اور اپنی ساری توانائیوں کو یکجا کر کے اپنے اندر یہ کہنے کی جرأت پیدا کی کہ وہ حج کو نہیں جا رہا ہے ——— اس کی زبان سے اس لفظ کا نکلنا تھا کہ سارے لوگ سکتے میں آ گئے گھر والوں کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی — اور مجمع یہ کہتے ہوئے منتشر ہو گیا؛ ———

"یہ شخص شروع ہی سے ایسا ہے اس نے ایک خاص مقصد کے تحت اپنے اس عزم کا اعلان کیا تھا۔ اور وہ مقصد اسے پہلے ہی حاصل ہو گیا۔ لوگ اس کی قدر و منزلت کرنے لگے، سماج میں اس کی وقعت بڑھ گئی اور سبھوں نے اسے اپنا مقتدا تسلیم کر لیا، اب اسے حاجی کہلانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اور ایک منچلے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: ———

"یہ شخص روزے نماز کا پابند صرف اس سبب کر اس میں کوئی رقم صرف کرنی نہیں پڑتی لیکن حج میں تو ایک بھاری رقم کا صرفہ ہے۔ یہ رقم اسے صرف کرتے آنکھ لگتی ہے، اب اسی رقم سے یہ جائداد خریدے گا۔"

کارواں جا چکا تھا۔ اور اب صدائے جرس بھی نہیں آ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو شخص تمام لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا، اب وہی ہدفِ ملامت تھا۔

حج کا موسم شروع ہو چکا تھا، تمام خطۂ ارض سے عازمینِ حج لاکھوں سے زیادہ کی تعداد میں حج زیارت سے مشرف ہونے کے لئے حرم کی سرزمین پر جمع ہو گئے تھے؛ "لبیک اللھم لبیک" کی صدائے بازگشت سے دشت و جبل گونج رہے تھے۔ میدانِ عرفات میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ منیٰ اور مزدلفہ کی وادیوں میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اللہ کے ایک مقبول و محبوب بندے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ جبلِ عرفات پر محوِ عبادت تھے۔ ان کے کان میں ایک آواز آئی ——— "امسال کسی کا حج قبول نہیں ہوا۔" ——— یہ آواز ہاتفِ غیب کی تھی، یہ آسمان کی لامحدود بلندیوں سے اتری تھی۔ حضرت ذوالنون اس آواز سے چونک اٹھے۔ انہیں حیرت ہوئی۔ حیرت کی بات بھی تھی۔ لاکھوں کے جم غفیر میں ایک بھی اس قابل نہیں ہوا کہ اس کا حج قبول کیا جاتا۔ یا عجب! لیکن ابھی وہ واقعہ کی نوعیت پر غور ہی کر رہے تھے کہ دوسری آواز آئی ——— "فلاں کے صدقے میں سبھوں کا حج قبول کیا جاتا ہے جو حج کی نیت کرنے کے باوجود

یہاں تک نہیں آسکا۔ یہ آواز پہلے سے زیادہ چونکا دینے والی تھی۔ اس آواز میں متحیر کر دینے والا عنصر زیادہ شامل تھا۔ حضرت ذوالنون کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ جو شخص حج کی نیت کرنے کے بعد بھی حج سے محروم رہے گا؛ وہ مستوجب عذاب ہونے کی بجائے ان سزاوار انعام کیوں کر ہو گیا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ وہ مناسک حج سے فراغت کے بعد اس فلاں آدمی سے ضرور ملیں گے، اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کس عمل کے صلے میں اسے یہ اعزاز ملا۔

حضرت ذوالنون مہینوں کی مسافت طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہونچے جہاں اس سے ملاقات کرنی تھی۔ اس سے ملاقات کی۔ ور سفر حج نہ کرنے کا سبب پوچھا اس نے پڑوسی کا سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد بتایا کہ جب وہ پڑوسی کے مکان پر پہونچا تو اس کا پڑوسی لڑکھڑاتے قدموں سے آپ کے پاس آیا۔ اس میں چلنے کی سکت نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں اور اس کے چہرے سے افلاس ٹپک رہا تھا۔ اس کے بچے سامنے کی چٹائی پر پڑے تھے، اسے دیکھ کر بچوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ اٹھ نہیں سکے، کچھ اٹھے بھی تو ناتوانی نے انہیں فوراً لٹا دیا۔

پڑوسی نے بتایا کہ :-

"پانچ دنوں کے مسلسل فاقوں نے ان سبھوں کو ہلاکت کے قریب کر دیا تھا۔ اتفاق سے آج وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا جنگل کی طرف جا نکلا۔ وہاں اسے ایک مرے ہوئے گدھے کی لاش زمین پر پڑی مل گئی۔ یہی مردار گدھا آج اس کی اور اس کے بچوں کی غذا تھی۔"

اس واقعہ نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا اور اسی وقت اس نے ٹھان لی کہ اب وہ حج نہیں کرے گا اور جو رقم اس نے حج کے زاد راہ کے طور پر مہیا کر رکھی ہے۔ اس خاندان پر صرف کر دے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب اس کے گھر کے سب لوگ سو گئے تو وہ چپکے سے اٹھا اور اشرفیوں کی تھیلی پڑوسی کو دے آیا۔

اتنا کہنے کے بعد وہ چند لمحے کے لئے رکا اور پھر اس نے کہنا شروع کیا :-

"یہ بات آج تک اس کے گھر والوں کو بھی معلوم نہیں ہے کہ اس نے عین وقت پر کیوں سفرِ حج ملتوی کر دیا اور اشرفیوں کی وہ تھیلی کیا ہوئی جو کئی برسوں کی لگاتار کوششوں کے بعد اس کے ہاتھ میں آئی تھی؟"

آخر میں اس نے یہ بھی کہا ——

"اسے حج نہ کرنے کا غم ضرور ہے، لیکن اس سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ایک مسلم خاندان کو اس نے ہلاکت سے بچا لیا۔"

حکایت کی زبان میں اس کردار کے ہیرو کو حضرت احمد بن اسکاف دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کی زاہدانہ زندگی اور آپ کے کردار و عمل کے سارے نقوش تاریخ کے صفحات میں منضبط ہیں۔

ضیا احمد نوری

کہتے ہیں کہ ایک دن شہنشاہ ہندوستان حضرت اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دیوان عام میں جلوہ گستر تھے کہ نقیب نے آکر اطلاع دی۔

جہاں پناہ! ایک فریادی محل کے دروازے پر کھڑا ہے۔ باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ حکم ہوا بار یاب کرو۔

چند ہی لمحے کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دربار میں حاضر ہوا شہنشاہ نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دُور دُور سے آئے ہوئے فریادیوں کے مقدمات کی سماعت سے فارغ ہو چکنے کے بعد اب شہنشاہ اس اجنبی شخص کی طرف مخاطب ہوئے:——

"دربار شاہی میں کیا فریاد لائے ہو؟"

"جہاں پناہ۔ میں ایک بہروپیا ہوں۔ صرف اس تمنا میں گجرات سے حاضر ہوا ہوں، شہنشاہ ہند کے دربار سے اپنے فن کا کوئی اعزاز حاصل کروں۔ اس دربار میں اہل کمال کی قدردانی کا بڑا شہرہ سنا ہے۔"

اورنگ زیب نے زیر لب تبسم فرماتے ہوئے جواب دیا:——

"تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ اہل کمال کی قدردانی ہمیشہ سے شاہی درباروں کا شیوہ رہا ہے۔ میں اجازت دیتا ہوں کہ اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ ایک بہروپیا کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے وجود کو اصلیت کے سانچے میں اس طرح ڈھال لے کہ نقل کا پہچاننا مشکل ہو جائے۔ تم نے اگر مجھے دھوکا دے دیا تو میں یقین کرلوں گا کہ تم اپنے فن میں کمال دستگاہ رکھتے ہو۔ اسی دن ایک قدردان کی طرح میں تمہارے کمال کی داد دوں گا۔"

شہنشاہ کا یہ جواب سن کر خوشی خوشی بہروپیا دربار سے رخصت ہوا اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر کئی دن تک یہ سوچتا رہا کہ کون سا روپ اختیار کیا جائے کہ بادشاہ کو بھرپور دھوکا دیا جا سکے۔

ایک مہم سے واپس ہوتے ہوئے شہنشاہ راستے میں بیمار پڑ گئے۔ دہلی کی راجدھانی میں ہل چل مچ گئی۔ ہر طرف عبادت خانوں اور درگاہوں میں دعائے صحت مانگی جانے لگی۔ شاہی بیگمات نے نفلی روزوں کی نذر مان لی۔ گلی گلی میں محتاجوں اور مسکینوں کو خیرات لٹائی گئی۔

علاج کے لئے ملک کے کونے کونے سے ماہر طبیبوں کا تانتا بندھ گیا۔ چند ہی دنوں میں شہنشاہ روبہ صحت ہونے لگے۔

غسلِ صحت کے دن ساری راجدھانی خوشی کے شادیانوں میں ڈوب گئی۔ بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد آج پہلی مرتبہ شہنشاہ دربارِ عام میں تشریف لانے والے تھے۔ مشتاقین دیر سے دربار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے ہوئے ہر شخص بادشاہ کی آمد کا منتظر تھا کہ اتنے میں نقیبوں نے آواز دی ——

سارا دربار سروقد کھڑا ہو گیا۔ مبارک باد اور ایامِ اقبال کی دعاؤں کی گونج میں شہنشاہ تختِ آبنوس پر جلوہ افروز ہوئے۔ اسی درمیان میں ایک چوبدار نے آکر خبر دی: ——

"جہاں پناہ کی علالتِ مزاج کی خبر ایران تک پہنچ گئی ہے۔ علاج کے لئے شاہ ایران نے اپنا خصوصی طبیب دربارِ عالی میں حاضر کیا ہے۔ وہ باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے"

شہنشاہ نے اس خبر کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے باریاب ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ سارے درباری ایران کے شاہی طبیب کو دیکھنے کے لئے متوجہ ہو گئے

تھوڑی ہی دیر کے بعد حکمائے یونان کی دستار و عبا میں ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا اس کی پیشانی سے حکمت و دانائی کی ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس کے پیچھے غلاموں کی ایک جماعت تھی جن کے سروں پر دواؤں کے چھوٹے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے۔

سارا دربار شاہ ایران کے جذبۂ ہمدردی کی ستائش سے گونج اٹھا۔

لاشریک ہے جیسے جہاں پناہ کی سطوت شاہانہ!

شبہائے تار کی روشنی، دیدۂ عقل کا چراغ، چمنستانِ آرزو کا بادِ بہشت

سارے ناموں سے ترکستان کے جوہریوں نے اسے موسوم کیا ہے

فرمانروائے ہند کے حضور میں یہ تحفۂ نایاب پیش کرتے ہوئے آج میری

مسرتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہوئے صندوق کو پائے گاہ شاہی میں رکھ کر جیسے ہی واپس لوٹنا چاہتا تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے زیرلب تبسم فرماتے ہوئے جواب دیا ——

"اس بار بھی ہم نے تمہیں پہچان لیا۔"

یہ الفاظ تیر کی طرح اس کے جگر میں ترازو ہوگئے اور اضطراب میں بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو سنبھال سکا۔ اس بار کی چوٹ اتنی گہری تھی کہ بہت دنوں تک اس کے دل کا زخم رستا رہا۔ ہزار شکست و ریخت کے بعد بھی اس بار اس نے اپنا حوصلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کے فن کی غیرت جاگ اٹھی اور آخری بار وہ اپنی قسمت آزمائی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد دکن کے علاقے سے یہ خبر موصول ہوئی کہ وہاں بہت سے راجاؤں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے اور وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ مقتضائے وقت کے مطابق آتش بغاوت فرو کرنے اور باغیوں کو کیفر کردار تک پہونچانے کے لئے شہنشاہ اورنگ زیب نے بذات خود دکن کی مہم پر روانگی کا ارادہ فرمالیا۔ ملک کے گوشے گوشے سے ایک عظیم لشکر کی ترتیب کا کام شروع ہوگیا۔ ساری تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد ایک معین تاریخ پر شہنشاہ کی روانگی طے پاگئی۔

آج صبح سویرے حضرت اورنگ زیب ایک لشکر جرار [illegible] دکن کی طرف روانہ ہوگئے۔ جس جس گذرگاہ سے شاہی [illegible]

تھے. سارے علاقے میں دھوم مچ جاتی تھی. سفر کا روٹ آبادیوں اور شہروں سے ہٹ
کر زیادہ تر پہاڑوں اور جنگلوں کو عبور کرتے ہوئے بنایا گیا تھا.

صبح و شام موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق یہ مہم نہایت سنگین ہوتی جا
رہی تھی۔ باغیوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے آپس میں متحد ہوتے جا رہے تھے۔ اس طرح
دکن میں ایک باغیانہ قوت مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے اس سفر میں ہر دوسرے
تیسرے پڑاؤ پر نئی نئی کمک فوج میں شامل ہوتی جا رہی تھی.

حضرت اورنگ زیب طبعاً بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے ساتھ گہری
عقیدت رکھتے تھے. اس لئے دستور یہ تھا کہ راستے میں جہاں جہاں بھی کسی بزرگ کا
مزار ملتا قافلہ روک کر مزار پر حاضری دیتے، فاتحہ پڑھ کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے
اور روانہ ہو جاتے.

دورانِ سفر میں ایک پہاڑی سلسلے کو عبور کرتے ہوئے ایک جگہ سے گذرے
تو دیکھا کہ کئی ہزار انسانوں کا ہجوم لگا ہوا ہے. خیموں اور پھونس کے جھونپڑوں
کی ایک بستی بس گئی ہے — کہسار کے ویرانوں میں آدمیوں کا یہ میلہ دیکھ کر
شہنشاہ کو بڑی حیرت ہوئی.

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب ہی پہاڑی کھوہ میں ایک خدا رسیدہ بزرگ
ہیں جن کی زیارت اور حصول فیض و برکت کے لئے مہینوں سے یہاں میلہ لگا ہوا ہے.
سینکڑوں بندگانِ خدا یہاں سے فیضیاب ہو کر واپس لوٹے ہیں.

لوگوں نے بتایا ان کی عجیب شان ہے نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں. اور نہ کسی سے
بات کرتے ہیں. سدا آنکھیں بند کئے ہوئے یادِ الٰہی میں محو رہتے ہیں ان کے قریب
پہنچ کر دل کی حالت غیر ہو جاتی ہے. ان کے پُرنور چہرے پر نظر ڈالنے کی تاب بڑی
مشکل سے کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے

یہ حالات سن کر حضرت اورنگ زیب کے دل میں بھی ان کی زیارت کا شتیاق
ہو گیا. میر لشکر کو حکم دیا کہ یہیں پڑاؤ ڈال دیا جائے دو ایک دن میں پہاڑ کا طویل و

عریض دامن میں ایک شہر میں تبدیل ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی اس لئے طے پایا کہ صبح کے اجالے میں درویش کی زیارت کے لئے شہنشاہ تشریف لے جائیں گے

صبح ہوتے ہی پہاڑی تک ساری گذرگاہ کو سپاہیوں نے ہموار کر دیا ایک خدا رسیدہ بزرگ کی زیارت کی نیت سے شہنشاہ نے غسل کیا۔ نئے کپڑے زیب تن فرمائے۔ دو رکعت نماز نفل ادا کی اور برہنہ پا پیدل گھر سے ہوئے۔ عقیدت کا یہ اہتمام شوق دیکھ کر لوگوں نے بادشاہ کی نیک نیتی اور درویش نوازی کا اعتراف کر لیا۔ غار کے دہانے پر پہونچ کر شہنشاہ رک گئے۔ خادم نے بتایا کہ ابھی حضرت عالم استغراق میں ہیں۔ تھوڑی دیر توقف کیا جائے۔ شہنشاہ مجسمہ عقیدت بنے ہوئے انتظار شوق میں کھڑے رہے کچھ وقفے کے بعد خادم نے آکر اطلاع دی کہ اب اندر تشریف لے چلئے۔ اندر کے حصے میں چونکہ رات کی طرح اندھیرا تھا۔ اس لئے جگہ جگہ کافوری مشعل روشن کر دی گئی تھی۔ تاکہ شہنشاہ کو وہاں تک پہونچنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔

خدا رسیدہ بزرگ کے قریب پہنچ کر بادشاہ بہت زیادہ متاثر ہوئے فرش زمین پر ادب سے دو زانو بیٹھ گئے دیر تک ان کے روحانی فیوض و برکات کے امیدوار بن کر خاموش بیٹھے رہے۔ کافی عرصہ گذر جانے کے بعد بادشاہ نے اپنی مہم کی کامیابی کے لئے دعا کی درخواست کی۔

لیکن درویش نے بادشاہ کی عرضداشت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ بدستور اپنے عالم محویت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے استغنا کی یہ شان دیکھ کر بادشاہ اور زیادہ معتقد ہو گیا۔

کافی دیر ہو چکی تھی اس لئے بادشاہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ خادم باہر نکل چکا تھا۔ اب مکمل تنہائی کا عالم تھا۔ بادشاہ نے وقت رخصت درویش کی خدمت میں اشرفیوں کا ایک توڑا بطور نذر پیش کیا۔ اور اٹھتے ہوئے جیسے ہی وہ درویش کی دست بوسی کے لئے جھکا کہ بہروپیا نے دونوں ہاتھ سے بادشاہ کے قدم تھام لئے

"آہ! خدا شناسی اور فقیر و درویشی کے نقابوں سے دنیا میں کیسے کیسے لوٹا ہوگا۔ کون جانتا ہے؟ اس رہ کا فریب خوردہ ایک میں ہی نہیں تھا۔ میری طرح لاکھوں افراد شیطان کے مکر کا شکار ہوئے ہوں گے۔

صد حیف! کہ اس راہ کے فریب سے بچنا کتنا مشکل ہے؟ تسبیح و مصلےٰ، تقدیس و تہلیل اور ریاضت و عبادت کے چمکدار سکوں پر کون نہیں ریجھ جائے گا؟

پروردگار! تو ہی اپنے محبوب کی بھولی بھالی امّت کو وقت کے فریب کاروں سے بچانا۔"

علّامہ ارشد القادری

خدا شوق دے تو

ایمان افروز علمی کُتب مطالعہ فرمائیں

قانونِ شریعت
نورانی تقریریں
روحانی حکایات (اوّل)
عجائب القرآن
عقائد اہلسنت
برقِ آسمانی
سیرِ گلستان
مناظرہ جھنگ
انیس الارواح
امام نعت گویاں
الحق المبین
التبشیر برد التحذیر
الشاہ احمد رضا بریلوی
حضور الحرمین
مدینہ مدینہ ایں

سیرتِ مصطفےٰ
ایمانی تقریریں
روحانی حکایات (دوم)
غرائب القرآن
العذاب الشدید
اکابرینِ دیوبند کا تکفیری افسانہ
زیر و زبر
مناظرہ علم غیب
تحفۂ مومن
مودودی جماعت کیا ہے؟
حیات النبی
کتاب التراویح
طمانچہ
انوار العرفان صلوٰۃ وسلام عند الاذان
گناں دی گتھلی

جنتی زیور
حقانی تقریریں
بہشت کی کنجیاں
جہنم کے خطرات
قہر خداوندی
دینِ فطرت
محمد رسول اللہ قرآن میں
الصوارم ہندیہ
باطل اپنے آئینے میں
ہند کے راجہ
معراج النبی
آئینۂ حق
ہاتھی کے دانت
کلام ناصر
بیضاوی شریف

قرآنی تقریریں
عرفانی تقریریں
کراماتِ صحابہ
نوادر الحدیث
برہانِ صداقت
اسرار الاولیاء ملفوظات بابا
منکرینِ رسالت کے
افضلیت سیدنا
بدر الکبریٰ
خطبات برطانیہ
میلاد النبی
احکام رمضان
نورِ ایمان

مکتبہ فریدیہ جناح روڈ ساہیوال